



Atlantis  
Publications

# بغداد کی دھڑکن

اشتیاق احمد

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

”دنیا کے اُس پار“ کا پہلا حصہ

# بغاوت کی دستک

اشتیاق احمد



## چو کس رہو

”محمود! آج تم بہت اداس ہو۔“ فاروق نے پریشان آواز میں

کہا۔

”میں.... میں تو بالکل اداس نہیں ہوں.... نہ مجھے

اداسی کی وجہ دور دور تک نظر آ رہی ہے۔“ محمود حیران ہو کر بولا۔

”وجہ نظر آیا نہیں کرتی، خیر.... تو پھر فرزانہ تم اداس ہو۔“

فاروق اس کی طرف مڑا۔

”بالکل نہیں.... میں بہت خوش ہوں۔“ اس نے بہت برا سا

منہ بنایا۔

”بہت خوش لوگ بہت برے منہ نہیں بنایا کرتے.... خیر.... تو

ای جان آپ تو ضرور اداس ہیں۔“ فاروق ان کی طرف مڑ گیا۔

”آخر آج تمہیں ہو کیا گیا ہے.... میں کیوں ہونے لگی اداس۔“

”اباجان آپ.... آپ تو خیر اداس ہیں ہی۔“

”دماغ تو نہیں چل گیا.... سب کو اداس کرنے کا ٹھیکالے لیا

ہے کیا۔“

”یہ بات نہیں۔۔۔ ایک منٹ۔۔۔ یہ کہہ کر اس نے فون اپنی طرف سرکایا اور اس پر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

”کسے فون کرنے لگے۔“ انپکٹر جمشید نے منہ ہنایا۔

”جی انکل خان رحمان کو۔“

”ان سے کیا کہتا ہے؟“ محمود بولا۔

اسی وقت سلسلہ مل گیا۔

”انکل! یہ میں ہوں۔“

”قاروق۔۔۔ بھئی یہ بتانے کی بھلا کوئی ضرورت ہے۔“ خان رحمان کی چمکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”آپ آج اداس ہیں۔۔۔ ہیں نا۔“

”نہیں تو۔۔۔ یہ کس احق نے کہہ دیا تم سے۔“

”شکریہ انکل۔۔۔ میں آپ کو پھر فون کروں گا۔“

”ارے ارے۔۔۔ سنو تو۔“

لیکن قاروق نے فون بند کر دیا اور اب پروفیسر داؤد کے نمبر

ملائے۔

”انکل! آپ آج اداس ہیں۔“

”اداس۔۔۔ کیا مطلب؟“ ان کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔

”مجھے یقین ہے۔۔۔ آج آپ اداس ہیں۔“

”نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔“

”اوہ! تب تو برا ہوا۔“ وہ بولا۔

”کیا برا ہوا۔“ وہ حیران ہو کر بولے۔

”میں آپ کو پھر فون کروں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ

دیا اور ان کی طرف مڑا۔

”بات ثابت ہو گئی۔“

”کون سی بات ثابت ہو گئی۔۔۔ ہمیں تو یہاں دور دور تک ایسی

بات نظر آ رہی تھی۔۔۔ بات ثابت ہو گئی ہو۔“ محمود نے جھٹلائے ہو

انداز میں کہا۔

”حد ہو گئی۔۔۔ میں کہتی ہوں۔۔۔ ایسی بات بھی کب نظر آ رہی

ہے۔۔۔ جو ثابت نہ ہوئی ہو۔“ فرزانہ نے پاؤں پٹختے۔

”قاروق کا آج دماغ چل گیا ہے۔۔۔ یہ بات ثابت ہوئی ہے

شاید۔“ انپکٹر جمشید مسکرائے۔

”یہ بات نہیں اباجان۔۔۔ آج میں بہت اداس ہوں۔۔۔ بات بس

اتنی سی ہے۔۔۔ ایسے میں مجھے یاد آ گیا کسی شاعر کا ایک شعر۔۔۔ میں نے

سوچا۔۔۔ ذرا اس شعر کا وزن کر لوں۔“

”شیر کا وزن۔“ انپکٹر جمشید گھبرا گئے۔

”جی نہیں۔۔۔ وہ تو بہت زیادہ ہوتا ہے اور شیر تو ویٹ مشین پر

کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔۔۔ کیونکہ اس کی چار ٹانگیں ہوتی ہیں۔۔۔ میں تو

شاعری والے شعر کی بات کر رہا ہوں۔“



”اور تمہیں کون سا شعر یاد آگیا تھا؟“ بیگم جمشید مسکرائیں۔  
”کسی شاعر نے کہا ہے۔

دل تو اپنا اداس ہے ناصر  
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے  
”یہ کسی شاعر نے نہیں... کسی ناصر نے کہا ہے۔“ محمود بولا۔  
”ارے تو وہ بھی تو شاعر ہی ہو گا نا... ہاں تو یہ بات آج بالکل  
درست ثابت ہو گئی... جب انسان خود اداس ہو تو اسے سب اس  
تختے ہیں۔“

”لیکن سوال تو یہ ہے کہ تم اداس کیوں ہو۔“

”یہی بات تو سمجھ میں نہیں آ رہی اب تک کہ میں اداس کیوں  
ہوں۔“ فاروق نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔  
”یار بلاوجہ دماغ نہ چاٹو۔“ انپکٹز جمشید جھلائے۔  
”آپ کو خوش فہمی ہو گئی ہے اباجان۔“  
”خوش فہمی... مجھے... کیا بے پر کی اڑا رہے ہو۔“ وہ حیران ہو  
کر بولے۔

”بھلا میں کیوں چائے لگا آپ کا دماغ۔“

”تو یہ خوش فہمی ہو رہی تھی مجھے... تم آج مار تو نہیں کھاؤ  
گے۔“ انہوں نے آنکھیں نکالیں۔  
”اداس تو پہلے ہی ہوں... مار کھانے کے بعد غمگین بھی ہو

جاؤں گا۔“ فاروق بولا۔

”سوائے ادھر ادھر کی ہانکنے کے ان صاحب کو کچھ نہیں آتا۔“  
فرزانہ نے جل کر کہا۔

”یوں تو مجھے اور بہت کچھ آتا ہے... البتہ جانا کچھ نہیں۔“  
”لیجئے... یہ ایک اور کمی... جانا کچھ نہیں۔“ محمود الٹا۔  
عین اسی وقت فون کی کھنٹی بجی۔  
”آگئی مصیبت۔“ فاروق بولا۔

”چلو اچھا ہے... تمہاری اداسی تو دور ہو گئی۔“ بیگم جمشید مسکرا  
دیں۔

ادھر انپکٹز جمشید ریسیور اٹھا چکے تھے۔

”یس سر... جی جی... کیا فرمایا... اوہ نہیں... ہیں... کیا...  
نہیں... یہ کیسے ہو سکتا ہے... اف... مالک... اچھی بات ہے... میں  
آ رہا ہوں۔“

انہوں نے ریسیور رکھ دیا... وہ خلا میں گھور رہے تھے... پھر وہ  
چھلانگ مار کر اٹھے اور دروازے کی طرف دوڑ گئے۔

”کیا ہوا اباجان... کیا ہم بھی آئیں۔“

”نہیں... بیس ٹھہرو... چوکس رہو... خطرہ سر پر ہے۔“  
دوسرے ہی لمحے وہ کار میں بیٹھ کر یہ جا ہوا ہو چکے تھے۔  
”فون کس کا تھا؟“ محمود بڑبڑایا۔

”میں کیسے بتا سکتا ہوں۔“ فاروق نے اسے گھورا۔

”میں نے تم سے نہیں پوچھا۔“

”فرزانہ بھی یہ بات کس طرح بتا سکتی ہے۔“

”میں نے فرزانہ سے بھی نہیں پوچھا۔“ وہ چلایا۔

”ای جان بھی یہ کس طرح بتا سکتی ہیں۔“ فاروق نے جل بھن کر کہا۔

”میں نے ای جان سے بھی نہیں پوچھا۔“

”تو پھر کیا ہوا ہے پوچھا تھا۔ اگر یہ بات ہے تو لے لو جواب ہوا ہے۔“ وہ بھنا کر بولا۔

”تم تو بلا وجہ ہواؤں میں اڑ رہے ہو۔ کبھی اداسی کی بات کرتے ہو تو کبھی آئیں بائیں شائیں کرنے لگتے ہو۔ کام کی بات تو تم سوچ ہی نہیں سکتے۔ میں نے بات خود سے کہی تھی۔“

”ادھو۔ اچھا۔ تو پھر تمہیں اپنے آپ سے کیا جواب ملا۔“

”اپنے آپ سے جواب۔ کیا مطلب؟“ محمود نے اسے گھورا۔

”جب تم نے خود سے ایک سوال پوچھا تو جواب بھی تو خود سے ملے گا۔“

”کان نہ کھاؤ۔“ محمود بھنا اٹھا۔

”فرزانہ دیکھنا۔ اس نے کانوں کو شہد لگا رکھا ہے کیا۔“

”نہیں تو۔ شہد کا تو دور دور تک پتا نہیں۔ آج کل برستہ منہ

ہے۔“ فرزانہ نے اس کے کانوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”آج کسی چیز کا دور دور تک پتا نہیں چل رہا۔ کہاں رکھ دیتے

ہو تم اپنی چیزیں۔“ بیگم جمشید نے منہ بھنایا۔

”چاند کے اس پار۔“ فاروق مسکرایا۔

”کیا کہا۔ چاند کے اس پار۔“ فرزانہ چونکی۔

”کیوں! اس میں چونکنے کی کیا ضرورت پیش آگئی۔“ محمود کے لہجے میں بلا کی حیرت دوڑ گئی۔

”ضرورت پیش آنے کی بھی ایک ہی کمی۔ بھی ضرورت تو کسی چیز کی بھی کسی بھی وقت پیش آ سکتی ہے۔“

”حد ہو گئی۔ شاید آج کے دن ہم کوئی کلام کی بات نہیں کریں گے۔“

عین اسی وقت دروازے کی تھنٹی بجی۔ انداز خان رحمان کا تھا۔ وہ فوراً دروازے کی طرف دوڑے۔ دروازہ کھولتے ہی ایک ساتھ بولے۔

”السلام علیکم اکل۔“

لیکن پھر ان کی آنکھیں مارے حیرت کے پھیلتی چلی گئیں۔ اوپر کے سانس اوپر اور نیچے کے نیچے رہ گئے۔

○☆☆○

الیکٹر جمشید نے صدر صاحب کے سامنے پہنچ کر دم لیا۔



”ہاں! اب بتائیں۔ آپ نے فون پر کیا فرمایا تھا۔“  
 ”میں نے غلط نہیں کہا تھا جشید۔ آؤ میں تمہیں دکھاتا ہوں۔“  
 ”ویسے میں نے ابھی تک اس بات کا ذکر کسی سے بھی نہیں کیا۔“  
 ”آپ نے اچھا کیا۔“ وہ بولے۔

صدر انہیں اپنے ساتھ ایک اندرونی کمرے میں لے آئے۔  
 اس کمرے میں چاروں طرف جدید ترین الماریاں نصب تھیں۔  
 ”یہ ڈیکور جشید۔ میں نے اس الماری کا تالا کھولا تھا۔“ وہ  
 ایک الماری کے سامنے رکتے ہوئے بولے۔

”اور کیا آپ نے باقی الماریوں کو کھول کر دیکھ لیا ہے۔“  
 ”نہیں۔ ہمت نہیں پڑی۔“ صدر صاحب بولے۔  
 ”خیر۔ مجھے دکھائیں کھول کر۔“

انہوں نے تالے کے نمبر ملائے اور پھر الماری کا دروازہ کھل  
 گیا۔ اندر کا منظر دیکھ کر انسپکٹر جشید کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔  
 ”اف مالک۔ یہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

”ذرا سوچو جشید۔ اگر باقی الماریوں کا بھی یہی حال ہے۔ تو  
 میرا کیا بنے گا۔ پورے ملک کا کیا بنے گا۔“  
 ”خیر۔ یہ سامنے والی کھولے۔“ انسپکٹر جشید ڈوبتے دل کے  
 ساتھ بولے۔

صدر صاحب نے لرزتی انگلیوں سے تالے کے نمبر ملائے اور

الماری کو کھول ڈالا۔ دونوں کمرے کے عالم میں رہ گئے۔ پھر انہوں نے  
 باری باری سب الماریوں کو دیکھ ڈالا۔ سب کا حال ایک جیسا نظر آیا۔  
 ”کمرے کو تالا لگا دیں۔ ابھی اس بات کا ذکر کسی سے نہ  
 کریں۔ ہم پہلے غور کریں گے۔ پھر کوئی قدم اٹھائیں گے۔“

”اب ہم کیا قدم اٹھائیں گے جشید۔ قدم وہ اٹھائیں گے  
 جنہوں نے یہ کام کیا ہے۔ انہیں تو معلوم ہے کہ وہ کیا کر چکے ہیں۔“  
 ”ہاں! لیکن فی الحال ہم تیل دیکھیں گے۔ تیل کی دھار دیکھیں  
 گے۔ اور ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔“

”مجھے پتہ ہے۔ اب جو تم کو گے۔ میں تو بس وہ کروں  
 گا۔“

”تو بس پھر خاموشی اختیار کر لیں۔ میں پہلے اپنے دوستوں  
 سے بات کروں گا۔ پھر آپ کو کوئی مشورہ دوں گا۔“

یہ کہہ کر انہوں نے گھر کے نمبر ملائے۔ لیکن سلسلہ نہ مل  
 سکا۔ انہیں بہت حیرت ہوئی۔ دوسرے فون کے نمبر ملائے۔ وہ بھی  
 بالکل بند تھا۔ تیسرے فون کے نمبر ملائے۔ وہ بھی بند تھا۔  
 ”اف مالک! یہ کیا ہو رہا ہے۔“ وہ کانپ کر بولے۔

”بلک۔ کیوں کیا ہوا؟“ صدر صاحب بوکھلا کر بولے۔  
 ”میرے گھر کے تینوں فون بالکل بند ہیں۔ جب کہ ابھی جب  
 میں گھر سے چلا ہوں تو تینوں فون ٹھیک تھے۔“



یہ کہہ کر انہوں نے ایک پیچ کے نمبر ملائے۔  
 ”میرے گھر کے تینوں نمبروں کو چیک کریں۔ جلدی۔  
 بتائیں۔“

”ایک منٹ سر۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔  
 اور پھر دوسرے انہیں بتایا گیا کہ تار کاٹ دیئے گئے ہیں۔  
 ”سمہ۔ میرے گھر میں بھی زبردست گزبڈ شروع ہو چکی ہے۔  
 پہلے مجھے وہاں جانا ہو گا۔“  
 ”ٹھیک ہے جشیہ۔ ضرور جائے۔ کیا میں اکرام کو بھی بھیج  
 دوں؟“

”ہاں سر۔۔۔ اکرام کو ہی نہیں۔ آپ ذرا انپکٹر کامران مرزا اور  
 شوکی برادرز کو بھی رنگ کر لیں۔ میں فوری طور پر ان کی ضرورت  
 محسوس کر رہا ہوں۔ شاید ہمارے ملک پر برا وقت آنے والا ہے۔  
 آپ اپنے بارے میں بھی سوچیں۔ اگر کل کے اخبارات میں اس  
 ڈاکے کے بارے میں کوئی خبر آگئی تو۔“

”تو پھر کیوں نہ جشیہ۔ ہم پہلے ہی خبر شائع کرا دیں کہ۔“  
 ”اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ اس لیے کہ آپ کے پاس کوئی  
 ثبوت نہیں ہو گا۔ ابھی آپ خاموش رہیں۔ پہلے میں مشورہ کر  
 لوں۔ اور یہ مشورہ انپکٹر کامران مرزا اور شوکی برادرز سے ہو گا۔  
 اور محمود فاروق اور فرزاد سے ہو گا۔“ انہوں نے باہر کی طرف دوڑ

لگاتے ہوئے کہا۔ صدر صاحب کا چہرہ ٹٹکا جا رہا تھا۔

مطلب یہ تھا کہ گزبڈ کی لپٹ میں خان رحمان اور پروفیسر داؤد  
 بھی آچکے ہیں۔

انہوں نے جھک جھک کرتے دل کے ساتھ دھواڑے پر دستک  
 دی۔ انہیں یوں لگا جیسے اندر ایک دم خاموش طاری ہو گئی ہو۔ پھر  
 کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز ان کے گھر کے کسی فرد  
 کی نہیں تھی۔ نہ ان کے دونوں دوستوں میں سے کسی کے قدموں کی  
 تھی۔ اس کا مطلب تھا۔ آنے والا کوئی اور تھا۔ انہوں نے فوراً  
 پستول نکال لیا۔ اسی وقت ایک آواز ان کے کانوں سے سر ٹکرائی۔

”پستول چلانے کی غلطی نہ کریں انپکٹر جشیہ۔ یہ گولی آپ کے  
 کسی عزیز کو لگے گی۔ مجھے نہیں۔“

انہوں نے اس آواز کو پہچان لیا۔ انہیں اپنے روٹے کھڑے  
 ہوتے محسوس ہوئے۔ پستول جیب میں ڈالنے کے بعد انہوں نے  
 جلدی جلدی خود پر قابو پایا اور پرسکون آواز میں بولنے کی کوشش کی۔  
 ”میں نے پستول جیب میں رکھ لیا ہے۔ دھواڑہ کھول دیں۔“  
 ”ضرور۔ کیوں نہیں۔ اسی لیے تو دھواڑے تک آگیا ہوں۔“

ان الفاظ کے ساتھ ہی دھواڑہ کھل گیا۔



## خواب دکھانے والے

انسپکٹر کامران مرزا نے اس دساقی کو غور سے دیکھا۔۔۔ پھر

بولے۔

”میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ آپ کتنا کیا چاہتے ہیں۔۔۔ آپ نے پھول کو سونگھا، آپ بے ہوش نہیں ہوئے اور آپ کی بیوی۔۔۔ آپ ذرا پھر سے بیان کریں۔“

”میں جانتا تھا۔۔۔ آپ بھی میری بات پر یقین نہیں کریں گے۔۔۔ لیکن پورے شہر میں آپ کے سوا مجھے کوئی دوسرا ایسا نظر بھی نہ آیا۔۔۔ جو میری بات سن لیتا۔۔۔ آپ نے بات سن تو لی۔۔۔ اچھا میں اجازت چاہتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھنے لگا۔

”آپ غلط سمجھے! میں نے یہ نہیں کہا کہ آپ غلط بیانی کر رہے ہیں بلکہ میں نے یہ کہا ہے کہ آپ کی بات کو سمجھ نہیں سکا۔۔۔ مہربانی فرما کر ایک بار پھر اپنی بات کو دہرائیے۔“

”جی اچھا! میں کوشش کرتا ہوں۔۔۔ ویسے اب تک میں نے جس آدمی کو بھی یہ بات بتائی ہے۔۔۔ اس کا میرے بارے میں یہ خیال

ہے کہ میں پاگل ہو چکا ہوں۔“

”میں ایسا نہیں سمجھتا۔۔۔ آپ پاگل نہیں ہیں۔۔۔ لیکن اپنی بات کو سمجھا نہیں پا رہے۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ میں ایک بار پھر عرض کرتا ہوں۔۔۔ یہ پرسوں رات کی بات ہے۔۔۔ میں اپنے گھر میں سو رہا تھا۔۔۔ میں نے خواب دیکھا۔۔۔ خواب میں چند پروں مجھے نظر آئیں۔۔۔ انہوں نے ایک پہاڑوں سے تیز ہوا تخت بچھایا۔۔۔ اس تخت پر انہوں نے مجھے بٹھا دیا اور پھر تخت ہوا میں اڑنے لگا۔۔۔ تخت اڑتا ہوا بادلوں تک جا پہنچا۔۔۔ مجھے بہت مزا آ رہا تھا۔۔۔ ساتھ ہی میں خوف بھی محسوس کر رہا تھا کہ کہیں تخت سے نیچے نہ گر پڑوں۔۔۔ لیکن پروں نے تخت کو چاروں طرف سے تھاما ہوا تھا۔۔۔ پھر تخت اترنے لگا۔۔۔ میں نے دیکھا، وہ پہاڑوں کے دوسری طرف اتر رہا تھا۔۔۔ آپ کو شاید معلوم ہو۔۔۔ پہاڑوں کے دوسری طرف دشمن ملک کا علاقہ ہے۔۔۔ اس علاقہ میں تخت ایک جگہ نیچے اتر گیا۔۔۔ اب میرے چاروں طرف پہاڑ ہی پہاڑ تھے۔۔۔ پریاں میرے ارد گرد ناچ رہی تھیں۔۔۔ آخر خدا خدا کر کے یہ ناچ ختم ہوا۔۔۔ اس وقت میں نے دیکھا۔۔۔ پہاڑوں کے درمیان بالکل سفید رنگ کا دودھ جیسا ایک محل کھڑا ہے۔۔۔ محل چاند کی روشنی میں اس قدر پیارا لگا کہ کیا بتاؤں۔۔۔ اہاں تک اس محل کا دروازہ کھلا اور دو کالے رنگ کے جن نمودار ہوئے انہیں دیکھ کر پریاں ادھر ادھر بھاگ گئیں اور جنوں نے مجھے اٹھا لیا۔۔۔



تخت وہیں رہ گیا۔ جن مجھے اس محل کے اندر لے گئے۔ وہاں شاہ جنات کا دربار لگا تھا۔ جنوں نے مجھے اس کے سامنے پیش کر دیا اور ایک نے کہا۔

”یہ آدم زاد ہمارے علاقے میں کس آیا ہے۔ شاہ جنات۔“  
 ”تو اس کا سر قلم کر دو۔“ وہ گرج دار آواز میں بولا۔

میں کا سر قلم کرنا۔ ایک جن نے جلاوٹ والا دست بڑا کھڑا اٹھا لیا۔ دوسرے نے میرا سر جھکا دیا۔ پھر جلاوٹ کا ہاتھ اٹھا اور کھڑا میرے سر پر لگا۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں بری طرح پیٹے میں نہلیا ہوا تھا انیسٹر صاحب۔  
 یہاں تک کہ کروہ خاموش ہو گیا۔

”بالکل ٹھیک۔ اس وقت تک کی بات میں کوئی عجیب بات نہیں۔ اس قسم کا خواب نظر آ سکتا ہے۔ خاص طور پر ایسے لوگوں کو جو جنوں پر یوں کی کہانیاں پڑھنے کے شوقین ہوں۔ آگے چلے۔“ انیسٹر کامران مرزا نے مسکرا کر کہا۔

”شکریہ۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ میں اپنے گھر میں تھا۔ پاس میری بیوی پڑی سو رہی تھی۔ میں نے اسے جگایا۔ اپنا خواب سنایا۔ وہ سن کر ہنسنے لگی۔ خیر دن نکل آیا۔ میرے ذہن میں اب تک وہی خواب گھوم رہا تھا۔ بے خیالی میں میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ کوئی نرم چیز میری انگلیوں کو محسوس ہوئی۔ جب میں نے

وہ نرم چیز نکالی تو میں حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ ایک پھول تھا۔ ایسا پھول میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ البتہ ویسے پھول اس تخت پر ضرور بچھائے گئے تھے۔ اور بادلوں کی سیر کے دوران میں نے وہ پھول تخت پر سے اٹھا کر سونگھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی خوشبو بہت پیاری تھی۔ اب جب وہ پھول جیب سے نکلا تو میں حیرت زدہ رہ گیا۔ میں نے پھول جیب میں رکھ لیا اور ایک بار پھر بیوی کو رات کا خواب سننے کی کوشش کی۔ وہ کہنے لگی۔ رات میں یہ خواب سنا تو چکا ہوں۔ میں نے اس سے کہا کہ ایک عجیب ترین بات ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے میں خواب دوبارہ سنانا چاہتا ہوں۔ خیر اس نے خواب دوبارہ سنا اور جب میں نے اس پھول کا ذکر کیا تو وہ خوف زدہ ہو گئی۔ میں نے جیب سے پھول نکالا اس نے ہاتھ میں لیا اور اس کو سونگھا۔ وہ فوراً بے ہوش ہو گئی تھی۔ میں ایک ڈاکٹر کو لے آیا۔ لیکن ڈاکٹر اس کی بے ہوشی کو دور نہ کر سکا۔ پھر میں نے کئی ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کیں۔ لیکن کچھ نہ بنا۔ اچانک مجھے اس پھول کا خیال آیا۔ میں نے پھول نکالا اور اس کے ناک سے لگا دیا۔ وہ ہوش میں آ گئی۔ میرے ذہن پر ایک خیال سوار ہو گیا۔ میں ان پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔ آپ کو بتانا چلوں۔ میں ایک کوہ چکا ہوں۔ میں نے کوہ چکا کی کئی انعام جیتے ہیں۔ میں اوپر چڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ پہاڑی کی چوٹی پر جا پہنچا۔ آپ جانتے ہیں۔ میں نے کیا دیکھا۔“ یہ کہہ کر وہ



خاموش ہو گیا۔

”آپ نے اس طرف وہ محل دیکھا ہو گا۔“ انپکڑ کامران مرزا مسکرائے۔

”اوه۔ آپ نے یہ بات کیسے جان لی۔“ اس کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

”پہلے آپ آگے جان کریں۔ مگر نہیں۔ پہلے آپ وہ پھول دکھائیں۔“

”ہاں کیوں نہیں۔ ضرور۔“ یہ کہہ کر اس نے پھول جیب سے نکالا۔ ایسے میں اس نے ناک پیچھے کر لیا تھا۔

”یہ ہوا پھول۔ لیکن آپ اس کو سونگھنے کا نہیں۔“

”فکر نہ کریں۔“ انہوں نے کہا اور پھول کو دیکھنے لگے۔ اپنے

بلک میں انہوں نے اس جیسا پھول کیسے نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ ان کی معلومات کے مطابق پوری دنیا میں ایسا پھول شاید نہیں ہو گا۔ وہ اس کو غور سے دیکھتے رہے۔ آخر بولے۔

”اب آپ اپنی باقی کہانی سنائیے۔“

”میری کہانی تو ختم ہو گئی۔ کیا آپ کو اس میں کوئی عجیب بات نظر نہیں آئی۔“

”عجیب باتیں تو اس کہانی میں بہت ہیں۔ اس پھول کی موجودگی آپ کی کہانی کی تصدیق کرنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا

ہے جیسے وہ خواب آپ کو دکھایا گیا ہے۔“

”جی کیا فرمایا۔۔۔ خواب دکھایا گیا ہے۔۔۔ بھلا خواب بھی دکھایا جا سکتا ہے۔“

”ہاں! آج کے دور میں خواب بھی دکھائے جا سکتے ہیں۔“

”آخر کیسے۔۔۔ اور پھر اگر مجھے بقول آپ کے خواب دکھایا گیا تھا تو وہ پھول کہاں سے آگیا میری جیب میں۔“

”خواب دکھانے والوں نے ایک پھول آپ کی جیب میں رکھ دیا ہو گا۔۔۔ خیر یہ کوئی ایسی بات نہیں۔۔۔ سوال یہ ہے کہ یہ خواب دکھانے سے ان کا مقصد کیا ہے۔“

”میں یہی الجھنیں تو محسوس کر رہا ہوں۔“

”یہ پھول آپ نے کسی اور کو نہیں سٹھکھایا۔“

”جی نہیں۔۔۔ میں بہت نہیں آرسہ۔“

”آپ یہیں تشریف رکھئے۔۔۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے، اپنے چڑیا گھر میں آئے۔ وہاں انہوں نے وہ پھول اپنی ایک ٹی کو سٹھکھایا۔۔۔ ٹی پھول سونگھتے ہی بے

ہوش ہو گئی۔۔۔ اب وہ واپس ڈرائنگ روم میں آئے۔ انہوں نے فون پر کسی کے نمبر ملائے۔

”پروفیسر قاسمی صاحب۔۔۔ انپکڑ کامران مرزا بات کر رہا ہوں۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ بہت ضروری کام ہے۔۔۔ اگر آپ آ سکتے ہیں تو بہت مہربانی ہو

دنیا کے اس پار

گی۔۔۔ درنہ پھر میں آتا ہوں۔۔۔ اوہ اچھا۔۔۔ بہت بہت شکریہ۔۔۔ اور ہاں آتے آتے آپ ڈاکٹر سلیمی صاحب کو بھی لیتے آئیں۔۔۔

یہ کہہ کر انہوں نے بریسور رکھ دیا اور دہائی کی طرف مڑے۔  
”میں نے یہ پھول اپنی پالتو بلی کو سگھایا تھا۔۔۔ وہ بے ہوش ہو گئی ہے۔۔۔“

”اوہ!“ اس کے منہ سے نکلا۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”میرا نام دلیر خان ہے۔“ اس نے کہا۔

”آپ کے گاؤں کا نام کیا ہے۔۔۔ اور شہر کے نام کیا ہے؟“

”گاؤں کا نام شان پورہ ہے۔۔۔ شال کی طرف واقع ہے۔۔۔ ہمارے

ملک کا اس علاقہ سے آخری شہر ہے کہ اس کے بعد سرحدی پہاڑ شروع ہو جاتے ہیں۔۔۔ اور پہاڑوں کے اس پار دشمن ملک کا علاقہ ہے۔۔۔“

”ہوں۔۔۔ اچھا۔۔۔“

اور پھر کمرے میں خاموشی چھا گئی۔۔۔ اسی وقت حکیم کامران مرزا نے چائے کی ٹریے اندر کی طرف بڑھا دی۔۔۔ انہوں نے ابھی چائے شروع کی تھی کہ دروازے کی کھٹکی بجی۔

”آپ چائے پیئیں۔۔۔ میں ذرا اپنے دوستوں کو لے آؤں۔۔۔“

وہ باہر گئے اور دوستوں کے ساتھ لوٹے۔

”یہ میرے دوست پروفیسر قاسمی ہیں اور یہ ڈاکٹر سلیمی۔۔۔ پروفیسر قاسمی ادویات کے ماہر ہیں۔۔۔ اور ڈاکٹر سلیمی خوابوں کے، نفسیات کے اور ہنپانڈم کے ماہر ہیں۔۔۔“

”آپ دونوں سے مل کر خوشی ہوئی۔“

”شکریہ۔۔۔ اور آپ نے ان کا تعارف نہیں کرایا۔“

”یہ دلیر خان ہیں۔۔۔ سرحدی گاؤں شان پورہ کے رہنے والے ہیں۔۔۔ اب میں ان کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ سناتا ہوں۔۔۔“

یہ کہہ کر انہوں نے دلیر خان کا خواب اور اس کے بعد کا واقعہ سنایا۔۔۔ اس کے خاموش ہونے پر بھی وہ دونوں کچھ نہ بولے۔۔۔ یوں لگتا تھا جیسے گہری نیند میں چلے گئے ہوں۔۔۔

”میں آپ کے تبصرے کا انتظار کر رہا ہوں۔“ آخر انہوں نے کہا۔

”اوہ ہاں۔۔۔ وہ چونک اٹھے۔

”تو پھر فرمائیے۔“

”وہ مصنوعی خواب تھا۔۔۔ اب ایسی مشین ایجاد کر لی گئی ہے۔۔۔ جسکے ذریعے سے ہم کسی کو بھی اپنی مرضی کا خواب دکھا سکتے ہیں۔۔۔ لیکن اس کے لیے مشین دماغ پر فٹ کرنا پڑتی ہے۔۔۔ پہلے ان کے دماغ پر مشین فٹ کی گئی۔۔۔ اس کے بعد پروجیکٹر پر قلم کی صورت میں وہ خواب دکھایا گیا۔۔۔ اور یہ صاحب یہ خیال کرتے رہے کہ وہ خود یہ



سکتا ہے۔“

36

خواب دیکھ رہے ہیں۔۔۔ اس کے بعد وہ پھول ان کی جیب میں رکھ دیا گیا۔“

”باٹ اگر یہاں تک ہوتی تو میں ہرگز پریشان نہ ہوتا۔۔۔ اصل معاملہ تو یہ ہے کہ پھاڑوں کے اس پار سفید محل موجود ہے۔“

”ہاں! اس پورے معاملے میں بس یہ بات زیادہ عجیب ہے۔“

”اور یہ پھول۔“

”یہ آپ مجھے دے دیں۔۔۔ میں اس کو لیبارٹری میں چیک کروں گا۔“

”اچھی بات ہے۔۔۔ آپ پھول لے جائیں اور جس قدر جلد ممکن ہو۔۔۔ مجھے اس کے بارے میں فون کریں۔“

”ٹھیک ہے۔“

”آپ ذرا مجھے اس مشین کے بارے میں بتادیں۔“

”وہ ایک بالکل نئی ایجاد ہے۔۔۔ ابھی ہمارے ملک میں نہیں آئی۔۔۔ بہت قیمتی ہے۔۔۔ اس کے ذریعے اپنی مرضی کے خواب دیکھے جاسکتے ہیں یا کسی دوسرے کو اپنی مرضی کے خواب دکھائے جاسکتے ہیں۔“

”تب پھر ان کا یہ خواب دکھانے سے ضرور کوئی مقصد ہے۔۔۔ کیونکہ اس طرف وہ محل موجود ہے۔“

”یہ سوچنا آپ کا کام ہے۔۔۔ کیونکہ یہ میدان آپ کا ہے۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔۔۔ ایک بات اور کسی کا خواب ریکارڈ بھی کیا جا

”اس مقصد کے لیے اس قسم کی دوسری مشین استعمال کی جاتی ہے۔۔۔ سوتے وقت اس مشین کے تار کے ساتھ لگی ایک نرم ملائم ٹوپی اوڑھا دی جاتی ہے۔۔۔ اب وہ شخص جو خواب بھی دیکھے گا۔۔۔ وہ اس میں قلم کی طرح ریکارڈ ہو جائے گا اور صبح آپ وی سی آر پر یہ دیکھ سکیں گے کہ رات بھر وہ شخص کیا کیا خواب دیکھتا رہا ہے۔“

”حیرت انگیز ایجاد ہے۔۔۔ ویسے میں نے کچھ عرصہ پہلے اخبار میں پڑھا ضرور تھا۔۔۔ اس وقت میں اس کو صرف اخباری خبر سمجھا تھا۔۔۔ آپ نے تصدیق کر دی۔۔۔ لیکن یہ مشین۔۔۔ یعنی مرضی کے خواب دکھانے والی اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“

ان کے رخصت ہونے کے بعد انسپکٹر کامران مرزا پھر ملاقاتی کی طرف متوجہ ہوئے۔

”دلیر خان صاحب! آپ کو وہ خواب دکھایا گیا ہے۔۔۔ لہذا آپ کی جیب میں پھول کا ہونا کوئی عجیب بات نہیں۔۔۔ جاتے ہوئے وہ یہ پھول آپ کی جیب میں رکھ گئے۔۔۔ باقی رہ گئی بات بے ہوشی کی۔۔۔ اس جیسے پھول پہلے کبھی نہیں دیکھنے میں نہیں آئے۔۔۔ لہذا میں پھولوں کے ایک ماہر سے ابھی بات کرتا ہوں۔۔۔ آپ کو جلدی تو نہیں ہے۔“

”نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔“ وہ مسکرایا۔

انہوں نے پھر ایک فون کیا، جلد ہی درمیانہ قد کے ایک صاحب وہاں پہنچ گئے۔

”آئیے پروفیسر نجی صاحب۔۔۔ آپ کو زحمت اس لیے دی ہے کہ ایک پھول ہمارے راستے میں آگیا ہے۔“

”پھول راستے میں آگیا ہے۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی۔“

”یہ بات اس طرح ہوئی کہ۔۔۔ پہلے آپ یہ پھول دیکھ لیں۔“

انہوں نے پھل نڈال کر جوڑی ان کے سامنے رکھا وہ بہت زور سے اچھلے۔۔۔ ان کی آنکھیں مارے حیرت کے پھینچ چلی گئیں اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”خیر تو ہے۔۔۔ آپ کی تو شاید شی گم ہو گئی ہے۔“

”شی ہی نہیں۔۔۔ اور بھی بہت کچھ گم ہو گیا ہے۔“ وہ بلیڑانے کے انداز میں بولے۔

”خیر۔۔۔ تو پھر بتائیے۔۔۔ یہ پھول کیسا ہے۔“

”پہلے آپ بتائیں۔۔۔ یہ آپ کو ملا کہاں سے اور آپ نے اس کو سونگھا تو نہیں۔“

”میں نے سونگھا۔۔۔ البتہ یہ صاحب سونگھنے کا تو نہیں سگھانے کا تجربہ ضرور کر چکے ہیں اور تجربے کے نتیجے میں ان کی بیوی بے ہوش ہو گئی تھی۔“

”بس بس۔۔۔ میں اسی لیے خبردار کرنا چاہتا تھا۔۔۔ اب دو گھنٹے بعد

انہیں چاہیے کہ یہی پھول اپنی بیوی کو پھر سگھائیں، اس لیے کہ وہ ہوش میں بھی اسی پھول سے آئیں گی۔“

”بہت خوب! یہ ہو چکا ہے۔۔۔ آپ تو ہمیں پھول کے بارے میں بتائیں۔“

”یہ۔۔۔ یہ پھول ہماری زمین کا نہیں ہے۔“

”کیا کہا۔۔۔ ہماری زمین کا نہیں ہے۔۔۔ تو پھر؟“ انپکٹر کامران مرزا دھک سے رہ گئے۔

”ہاں ہماری زمین کا نہیں ہے۔“ وہ بولے۔

”تو پھر۔۔۔ کس زمین کا ہے۔“

”یہ میں نہیں جانتا۔۔۔ لیکن اس کے بارے میں اب تک یہی اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ کسی دوسرے سیارے کا ہے۔“

”اوہ۔۔۔ نہیں۔“ انپکٹر کامران مرزا دھک سے رہ گئے۔

”اس وقت تک کی تحقیقات یہی ہیں۔۔۔ اس سے زیادہ اور کچھ معلوم نہیں کیا جاسکا۔“ انہوں نے بتایا۔

”لیکن یہ پھول ملا کہاں سے؟“

”شارجھان کے ایک سائنس دان رام پونی کو ایک روز یہ پھول اپنی تجربہ گاہ کے باغ میں اگا نظر آیا۔۔۔ وہ بہت حیران ہوئے، کیونکہ اس نے اس قسم کا پھول کبھی نہیں دیکھا تھا۔۔۔ نہ اس نے اس پھول کا پودا باغ میں کہیں سے لا کر لگایا تھا۔۔۔ حیرت کے عالم میں



اور بے خیالی میں اُن نے پھول توڑ لیا اور سو گتھ لیا۔۔۔ وہ تڑ سے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ اس کے ماتحت اسے اٹھا کر اندر لے آئے۔۔۔ اسے ہوش میں لاسلی ترکیبیں کی گئیں۔۔۔ لیکن کوئی ڈاکٹر انہیں ہوش میں نہ لاسکا۔۔۔ ایسے میں کسی ملازم نے سوچے سمجھے بغیر وہ پھول اس کے ناک سے لگا دیا۔ بس وہ ہوش میں آ گیا۔۔۔ اسی وقت سے اس پھول پر تحقیقات کر رہی ہیں۔۔۔ لیکن ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔۔۔

”یہ کب کی بات ہے؟“

”آج سے نی سال پہلے کی۔“ انہوں نے بتایا۔

”اوہ۔۔۔ تو کیا یہ خبر چھپا کر رکھی گئی ہے۔“

”ہاں بالکل۔ آپ خود سوچیں۔۔۔ ایک ایسا پھول جو دنیا بھر میں

نہیں ملتا۔۔۔ آخر زین پر کہاں سے آ گیا۔۔۔ اسے کون لایا۔۔۔ نہ صرف لایا۔۔۔ بلکہ پروفیسر ایم پونی کی تجربہ گاہ میں پھول یا پودا کون لگا کر چلا گیا۔“

”اور کیا پودا اب تک ہے؟“

”ہاں! مزید ہے۔۔۔ اس پر کئی اور پھول نکل چکے ہیں، لیکن۔۔۔

اس پودے کے گہرے دست پرہ ہے۔۔۔ اس پر مزید تحقیقات ہو رہی ہیں۔“

”اوہ اچھا۔ آپ کا شکریہ۔“

پروفیسر منجی کے جانے کے بعد انسپٹر کامران مرزا اس کی طرف مڑے۔

”اب اس محل کو دیکھنا ہو گا۔۔۔ دیے میرا خیال ہے۔۔۔ اس تخت پر اس جیسے مصنوعی پھول بچائے گئے ہوں گے۔۔۔ صرف یہ ایک اصلی پھول آپ کی جیب میں ڈالا گیا ہے۔“

”مم۔۔۔ مگر کیسے۔۔۔ سوال تو یہ ہے۔“

”تاکہ آپ ہمارے پاس آئیں اور اس پھول کے بارے میں بتائیں۔“ وہ مسکرا دیے۔

”کیا مطلب؟“ وہ بری طرح پتہ نہ لگا۔

”مطلب یہ کہ جن لوگوں نے آپ کو خواب دکھایا ہے۔۔۔ وہ حاجت ہیں۔۔۔ ہم اس پھول کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوں۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ پھول آخر کہاں سے آ گیا ہے۔۔۔ وہ اس کے بارے میں شدید الجھن میں مبتلا ہیں۔۔۔ ان کے سراغ رساں اس کا کوئی سراغ نہیں لگا سکے۔۔۔ لہذا انہوں نے کسی طریقے سے ہمیں اس طرف متوجہ کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔۔۔ اپنی طرف سے انہوں نے چال چلی ہے۔۔۔ لیکن دراصل ان کی یہ چال میں نے بھانپ لی ہے۔۔۔ اب آپ اپنے گھر جائیں۔۔۔ اس سلسلے میں آپ کو حیرت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔ معلومات حاصل کرنے کے بعد آپ کو بھی بتا دیا جائے گا۔۔۔ اول تو یہ آپ کا موضوع ہی نہیں ہے۔“

”بہت بہتر۔۔۔ آپ جانیں۔۔۔ آپ کا کام جانے۔۔۔ کیا میں چلوں؟“

”آپ کافی دور سے سفر کر کے آئے ہیں۔۔۔ لہذا کھانا کھا کر جائیں۔۔۔ کھانا تیار ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔۔۔ صرف تین منٹ بعد کھانا آپ کو مل جائے گا۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔۔۔ ویسے کھانے کی ضرورت نہیں تھی۔“  
”کوئی بات نہیں۔“

یہ کہہ کر انپکٹر کامران مرزا باہر آئے۔۔۔ بیگم کو کھانے کا کہا اور لاہوری میں گھس گئے۔۔۔ وہاں موجو، فون کے ذریعے سب انپکٹر شاہد کو ہدایات دیں اور پھر مہمان کے پاس آ گئے۔۔۔ کھانے کے بعد اسے رخصت کیا۔۔۔ پھول انہوں نے رکھ لیا تھا۔

”آج یہ تینوں کہاں رہ گئے؟“

”کہہ رہے تھے۔۔۔ سکول میں میچ ہے۔۔۔ دیر سے آئیں گے۔“  
بیگم بولیں۔۔۔

عین اس وقت دروازہ پورے زور سے دھڑ دھڑایا گیا۔۔۔ انپکٹر کامران مرزا بری طرح اچھلے۔۔۔ ساتھ ہی ان کی نظریں فرش پر پڑیں۔۔۔ وہ دھبک سے رہ گئے۔

○☆○

## جادو کا دیس

انہوں نے دیکھا، دروازے پر رٹور موجود تھا۔۔۔ وہی چھلاوہ جو ان کے دفتری حوالات سے اس طرح نکل کر بھاگ گیا تھا جیسے مکھن میں سے بال نکل جاتا ہے۔۔۔ اور جس نے آخری جھڑپ میں انہیں لوہان کر دیا تھا۔۔۔ اس کے باوجود وہ پکڑا نہیں جاسکا تھا۔۔۔ جس نے انہیں دھچکے پہ دھچکا دیا تھا۔۔۔ چکرا کر رکھ دیا تھا۔۔۔ اس وقت ایک بار پھر وہ ان کے سامنے تھا۔۔۔ اور بالکل اکیلا، اس کے ساتھ کوئی بھی نہیں تھا۔

”تو آپ میرے گھو میں تشریف فرما ہیں۔“ انپکٹر جمشید باخلاق انداز میں مسکرائے۔

”ہاں! اگرچہ میری تشریف آوری آپ کو ناگوار گزری ہو گی۔۔۔ لی بات ہے نا۔۔۔ وہ شوخ انداز میں مسکرایا۔

”اگر میرے گھر کے افراد خیریت سے ہیں اور میرے گھر کی کسی چیز کو آپ نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور نہ کوئی چیز اڑائی ہو تو اس صورت میں کہا جاسکتا ہے کہ آپ کا تشریف لانا ناگوار نہیں گزرا۔“



انسپکٹر جمشید سنجیدہ لہجے میں بولے۔

”اگر گزرا بھی ہو انسپکٹر جمشید صاحب۔۔۔ تو آپ میرا کیا بگاڑ لیں گے۔۔۔ میں آپ کی زندگی میں ناقابل تسخیر چیز بن کر آیا ہوں۔۔۔ آپ وہی ہیں جنہوں نے جیرال مجرم کو شکست دے دی ہے۔۔۔ کالی آنکھ آپ کے مقابلے میں نہ ٹک سکا۔۔۔ لی کاف۔۔۔ سی مون۔۔۔ جی عوف۔۔۔ رے رائٹ۔۔۔ حدیہ کر نظر نہ آنے والا مجرم ابظال تک آپ کے ہاتھوں شکست کھا چکا ہے۔۔۔ اور مسٹر جونٹ سے تو ابھی حال ہی میں آپ کی جھڑپ ہوئی ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔ اس بار میں آپ کے مقابلے میں ہوں۔۔۔ اگرچہ۔۔۔ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

”اگرچہ کیا؟“

”اگرچہ اس مہم کی باگ دوڑ بھی جیرال اور ابظال کے ہاتھوں میں ہے۔۔۔ میں اور جونٹ تو بس ان کی عملی میدان میں مدد کریں گے۔۔۔ دبلغ وہ لڑائیں گے۔۔۔ کام ہم کریں گے۔۔۔ اس بار گویا یہ منصوبہ نلے کر آئے ہیں۔“

”یہ کہ منصوبہ ہے۔۔۔ مقابلہ کرنے کا۔۔۔ مقصد کیا لے کر آئیں

ہیں؟“

”اس بار مقصد آپ کو نہیں بتایا جائے گا۔“

”کوئی پردا نہیں۔۔۔ ہم خود معلوم کر لیں گے۔“ انسپکٹر جمشید

سکرائے۔

”آپ اندر آ سکتے ہیں۔۔۔ کوئی پابندی نہیں ہے۔“ اس نے استادیتے ہوئے کہا۔

وہ اندر داخل ہوئے اور دھک سے رہ گئے۔۔۔ محمود، فاروق، فرزانہ اور بیگم جمشید صحن کے کونے میں پتھر کے بتوں کی طرح بیٹھے تھے۔۔۔ ان کے جسموں میں ذرا بھی حرکت نہیں تھی۔۔۔ نہ وہ پلکیں جھپک رہے تھے۔۔۔ انہیں اپنے روٹنے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔۔۔ کیونکہ ایسی حالت مردہ لوگوں کی ہوتی ہے۔

”تم نے ان کے ساتھ کیا کیا ہے؟“ انسپکٹر جمشید پھنکارے۔

”ابھی تک تو کوئی خاص معاملہ ان کے ساتھ نہیں کیا۔۔۔ اب آپ آگئے ہیں تو بہت کچھ کروں گا۔“

”لیکن یہ ساکت کیوں ہیں؟“

”آپ نے انسپکٹر جمشید۔۔۔ بچپن میں اپنی والدہ یا والد سے کہانیاں تو سنی ہوں گی۔۔۔ وہ جادوئی کہانیاں۔“

”میری والدہ مجھے جادوئی کہانیاں نہیں سنایا کرتی تھیں۔۔۔ وہ مجھے اسلام کے مجاہدوں کے قصے سنایا کرتی تھیں۔“ انہوں نے برا سا منہ بنایا۔

”خیر خیر۔۔۔ ان کہانیوں میں کچھ ایسا ہوتا تھا کہ کوئی شہزادہ یا شہزادی یا کوئی لکڑہارا۔۔۔ پتا نہیں ان کہانیوں میں کسی لکڑہارے کا ذکر ہی کیوں ہوا کرتا تھا۔۔۔ کسی موچی، ترکھان، نائی وغیرہ کا ذکر کیوں نہیں کیا



جاتا تھا۔۔۔ ہاں تو جادوئی دیس میں جانے کے بعد ان میں سے اگر کوئی پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا تھا تو وہ پتھر کا بن جاتا تھا۔۔۔ تو میرے انیکٹر جشید۔۔۔ آپ کے گھر کے افراد نے پیچھے مڑ کر دیکھ لیا ہے۔۔۔ اگرچہ میں نے انہیں منع بھی کیا تھا۔۔۔ کہ پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا۔۔۔ ورنہ پتھر کے بن جاؤ گے۔۔۔ لیکن انہوں نے میری ایک نہ مانی۔۔۔ اور پتھر کے بن گئے۔۔۔ اگر آپ کو یقین نہیں آ رہا تو انہیں چھو کر دیکھ لیں۔۔۔ ان سے بات کر کے دیکھ لیں۔۔۔

عین اس وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔۔۔ انداز خان رحمان کا تھا۔  
"میرے دوست آئے ہیں۔۔۔ میں ذرا انہیں بھی اندر لے آؤں۔"

"ضرور۔۔۔ کیوں نہیں؟" وہ مسکرایا۔

"انیکٹر جشید دروازے پر گئے۔۔۔ خان رحمان کے چہرے پر ہنس بولے۔  
حیرت نظر آ رہی تھی۔

"خیر تو ہے خان رحمان؟"

"خیریت فاروق سے پوچھیں گے۔۔۔ اسے کچھ ہو گیا ہے۔"

"وہ رہا فاروق؟ آؤ تم بھی آؤ۔" وہ بولے۔

"کیا بات ہے جشید۔ تمہارا لہجہ پرایا پرایا سا ہے۔" خان رحمان نے حیران ہو کر کہا۔

"مجھے تو سارا گھر پرایا پرایا لگ رہا ہے۔۔۔ تم تو بات کر رہے ہو

لہجے کی۔" انیکٹر جشید اداس انداز میں مسکرائے۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"اندر آ کر دیکھ لو۔"

وہ اس کے ساتھ اندر آ گئے۔۔۔ راٹور کو دیکھ کر وہ چونکے۔

"یہ۔۔۔ یہ کون صاحب ہیں؟"

"یہ مسٹر راٹور ہیں۔۔۔ ان کا ذکر میں تم سے کر چکا ہوں۔"

انہوں نے جلدی جلدی بتایا۔

"اوہ تو یہ وہ صاحب ہیں۔"

"ہاں! یہ سو فیصد سچی ہیں۔۔۔ اور یہ مجھے میرے گھر کے افراد۔۔۔ ان سے کچھ پوچھ سکتے ہو تو پوچھ لو۔"

"ارے! انہیں کیا ہو گیا ہے۔" خان رحمان خوف زدہ سی آواز

پر بولے۔

عین اس وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔

"یہ پروفیسر صاحب ہیں۔۔۔ جاؤ خان رحمان۔۔۔ پہلے تم انہیں اندر

لے آؤ۔۔۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں مسٹر راٹور۔"

"ارے نہیں۔۔۔ اعتراض کیسا۔۔۔ آپ کا اپنا گھر ہے۔" وہ ہنسا۔

"اوہ ہاں! یہ تو میں بھول ہی گیا کہ یہ میرا اپنا گھر ہے۔۔۔ تم نے

خان رحمان۔۔۔ یہ میرا اپنا گھر ہے۔"

"مم۔۔۔ میں۔۔۔ میں پروفیسر صاحب کو لا رہا ہوں۔۔۔ پتا نہیں



”ارے! یہ کیا... یہ... یہ... یہ کیا“۔

”پروفیسر صاحب ان سے ملے... یہ مسٹر رائور ہیں... ان سے ایک دو بار پہلے جھڑپ ہو چکی ہے... اور کچی بات یہی ہے کہ ہم نے ان کے ہاتھوں شاندار قسم کی شکستیں کھائی ہیں... لیکن اس وقت کی صورت حال کافی سنگین ہے... آپ ان چاروں کو دیکھ رہے ہیں“۔

”ہں! دیکھ رہا ہوں... یہ سکتے کی حالت میں ہیں“۔

”لیکن مسٹر رائور کا کہنا ہے کہ جس طرح پرے رماے (کمانوں میں... لوگ کسی جادوئی دیس میں پیچھے مڑ کر دیکھنے سے باز رہتے ہیں... سو یہ افراد میرے گھر کے بقول ان کے پیچھے مڑ کر دیکھ لینے کی وجہ سے پتھر کے بن گئے ہیں“۔

”نہیں... نہیں... یار جشید... تم تو آج بالکل فاروق کے انداز میں مذاق کر رہے ہو... اچھا اب سنجیدگی سے بتاؤ... بات کیا ہے؟“

”بات ہی تو آپ کو بتا رہا ہوں... اور سو فیصد سنجیدگی سے بتا رہا ہوں“۔

”کیا واقعی پتھر کے بن گئے ہیں، لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے“۔

”میں نے انہیں ابھی تک چھو کر نہیں دیکھا“۔

”ایک منٹ جشید“۔

یہ کہہ کر پروفیسر داؤد آگے بڑھے... انہوں نے فاروق کی پیشانی

یہاں کیا ہو رہا ہے... ویسے میری شئی گم ہوتی جا رہی ہے“۔ انہوں نے جلدی جلدی کہا اور دروازے کی طرف بڑھے۔

”نہ... نہ... ابھی اپنی شئی گم نہ کرنا... کام کی چیز ہے“۔ وہ بولے۔

”کک... کہیں تم میں روح کا فاروق تو حلول نہیں کر گیا“۔ انہں نے گڑبڑا کر کہا۔

”کیا کہا... روح کا حلول... وہ کیا ہوتا ہے“۔ رائور مارے حیرت کے بولا۔

”مم... میرا مطلب تھا... کہیں ان میں فاروق کی روح تو حلول نہیں کر گئی“۔ خان رحمان بولے۔

”آپ جائیں اور پروفیسر صاحب کو لے آئیں... پتا نہیں یہاں اور کون کون آئے گا“۔ رائور کا منہ بن گیا۔

”اگر آپ کو پروفیسر صاحب کی آمد ناگوار گزری ہے تو میں انہیں واپس بھیج دیتا ہوں“۔ انسپکٹر جشید جلدی سے بولے۔

”نہیں... اب واپس بھیجنے کی ضرورت نہیں... انہیں بھی لے آئیں... شاید آپ کو ان کی ضرورت ہے“۔ اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

خان رحمان گئے اور پروفیسر داؤد کو اندر لے آئے... اندر کا

دیکھ کر وہ بری طرح اچھلے۔

کو چھوای تھا کہ ان کے منہ سے تیز چیخ نکل گئی۔ وہ لڑکھائے اور گر پڑے۔

”ارے ارے۔۔۔ یہ کیا؟“

”جادوئی دیس میں پیچھے مڑ کے دیکھ لینے سے جو لوگ پتھر کے بن جاتے ہیں نا۔۔۔ ان لوگوں کو چھو دینے سے جسم کو کرنٹ بھی لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں انہیں کسی نے کبھی چھو کر نہیں دیکھا۔ اب انہوں نے کیا ہے۔ لہذا بے ہوش ہو گئے۔ اس میں میرا کیا قصور۔“ رائٹر نے منہ ہنایا۔

انسپکٹر جمشید اور خان رحمان پروفیسر داؤد پر جھک گئے۔ انہوں نے انہیں ہلایا جلا یا۔۔۔ تب کہیں جا کر انہوں نے آنکھیں کھولیں۔

”انہیں نہ چھو نا۔۔۔ ان میں کرنٹ ہے۔“ وہ خوف زدہ انداز میں بولے۔

”ارے باپ مرے۔“ خان رحمان کانپ گئے۔

”اگر ان میں بھی کرنٹ ہے تو پھر یہ زندہ نہیں رہ گئے ہوں گے۔“

”کرنٹ اس حد تک نہیں۔“

”پھر آپ بے ہوش کیوں ہو گئے تھے؟“

”اتنا کم بھی نہیں ہے۔“

”سوال تو یہ ہے کہ یہ زندہ ہیں یا نہیں۔“

”زندہ ہیں۔۔۔ لیکن حرکت نہیں کر سکتے۔۔۔ ان کے جسموں میں کرنٹ ہے، لہذا ہم انہیں چھو نہیں سکتے۔“ انہوں نے جلدی جدلی کہا۔

”خیمہ مسٹر رائٹر آپ بتائیں۔ آپ کیا چاہتے ہیں۔“

”صرف اور صرف ایک بات۔“ وہ مسکرایا۔

”اور وہ ایک بات کیا ہے؟“

”یہ کہ آپ لوگ بھی پتھر کے بن جائیں۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔“ وہ ایک ساتھ بولے۔

”جس طرح یہ پتھر کے بن گئے ہیں۔۔۔ اسی طرح آپ تینوں بھی پتھر کے بن جائیں اور درویش کی صدا کیا ہے۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

اور پھر ایک دم خان رحمان پر چھلانگ لگا دی۔ انہوں نے بچنے کی پوری کوشش کی، لیکن زد میں آئے بغیر نہ رہ سکے۔ اچانک ان کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔

”انسپکٹر جمشید نے دیکھا، خان رحمان کا بازو رائٹر کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔۔۔ اور ان کا جسم اس طرح لرز رہا تھا۔ جیسے انہوں نے بجلی کے ننگے تار کو ہاتھ میں لے لیا ہو۔ انہوں نے فوراً اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی۔ انہوں نے رائٹر کے سر کا نشانہ لیا تھا، لیکن وہ دھک سے رہ گئے۔ کیونکہ رائٹر ان کی چھلانگ سے پہلے خان رحمان سمیت وہاں سے اچھلا تھا اور کمرے کے دوسرے سر پر کھڑا نظر آیا تھا۔ اس وقت خان رحمان کا جسم بے حس و حرکت ہو گیا۔ وہ کسی بت کی طرح



کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ لیکن ان کی آنکھیں کھلی تھیں۔

”انسپکٹر جمشید ایک اور ساتھی پتھر کا بن گیا۔ ہاہا۔۔۔ پرانے زمانے کی کہانیوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ مزا آگیا۔ اس نے بلند آواز میں کہا۔

انسپکٹر جمشید اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے ایک بار پھر رائور پر منہ کرنے کے لیے پہنچے۔ یہیں اسی وقت رائور پر دوسرا دواؤ کی طرف ایک لمبی چمک کا پکا تھا۔ اس نے ان کا دھوکا لیا۔ ان کے منہ سے بھی چیخ نکل گئی۔ جسم میں رنٹ ہو گیا۔ وہ بری طرح لرزے لگے۔

انسپکٹر جمشید نے اس بار خوب سوچ سمجھ کر چھلانگ لگائی۔ لیکن منہ کے بل زمین پر آ رہے۔ ان کے ناک سے خون بہہ نکلا۔

”مجھ پر چھلانگ لگانے کی بہت بے چینی ہے۔ آئیے اب جی بھر کر چھلانگیں لگائیے۔ آپ کے بعد مجھے بیگم جمشید کو بھی پتھر کا بنانا ہے۔“

”تم بے وقوف ہو۔“ انسپکٹر جمشید نے جھلا کر کہا۔

”آخر کیسے۔۔۔ آپ میری بے وقوفی ثابت کر دیں۔ میں جان جاؤں گا۔“

”تم سمجھتے ہو۔۔۔ ہمارے ملک کے میں من مانی کرتے پھرو گے اور تمہیں کوئی روکنے والا یا ٹوکنے والا نہیں ہو گا۔ لیکن یہ تمہاری

بھول ہے۔۔۔ ہمارے ساتھی آتے ہی ہوں گے۔“

”کون سے ساتھی۔“ اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

”انسپکٹر کامران مرزا اور شوکی برادرز۔“

”وہ کس کھیت کی مولیاں ہیں۔۔۔ جب آپ میرے مقابلے میں پانی بھر رہے ہیں۔ اور ذرا غور کریں۔ ابھی صرف میں آپ کے مقابلے میں آیا ہوں۔ میرے تین بڑے تو ابھی آئے ہی نہیں۔۔۔ جیرال جس کی عقل کا مقابلہ کرنا آپ کے لیے ایک مسئلہ ہے۔۔۔ ابطال۔۔۔ جو نظر نہیں آتا۔۔۔ جوناٹ۔۔۔ جو۔۔۔“

”ہم لوگ جب ایک ساتھ آپ لوگوں کے مقابلے پر آئیں گے۔ اس وقت آپ کا کیا ہو گا۔“

”وہ بعد کی بات ہے۔۔۔ تم نے اب تک یہ نہیں بتایا۔ منصوبہ کیا ہے؟“

”نہیں بتا سکتے۔۔۔ ویسے ہے بہت خوفناک، ویسے آپ منصوبے کی ایک جھلک دیکھ تو آئے ہیں۔“

”تمہارا مطلب ہے۔۔۔ صدر صاحب کے ہاں میں جو کچھ دیکھ کر آیا ہوں۔۔۔ وہ اس منصوبے کی صرف ایک جھلک ہے۔“

”ہاں! کام تو ابھی آگے شروع ہو گا۔“

”اللہ اپنا رحم فرمائے۔“

ان الفاظ کے ساتھ ہی انہوں پھر اس پر چھلانگ لگائی۔ اس

وقت تک پروفسر داؤد بھی پتھر کی طرح ساکت ہو چکے تھے۔ انپکڑ  
جشید فرش پر ڈھیر ہو گئے۔ وہ پھر کھڑا مسکرا رہا تھا۔  
”نہیں۔۔۔ آپ مجھے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔“

”کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔“ انپکڑ جشید مسکرائے۔  
”اگر پتھر کا بننے کا ارادہ ہے تو آپ کی مرضی۔ جو نہی آپ مجھے  
ہاتھ لگائیں گے پتھر کے بن جائیں گے۔ یا میں آپ کو پکڑ لوں گا تو بھی  
آپ پتھر کے بن جائیں گے۔“ اس نے جلدی جلدی کہا۔  
”آخر یہ کیسے ہو جاتا ہے؟“ انپکڑ جشید کے لیے میں حیرت  
تھی۔

”بتایا تو ہے۔۔۔ آج کے دور میں پیچھے مڑ کر دیکھنے کی بھی  
ضرورت نہیں۔ انسان ایسے بھی پتھر کے بن جاتے ہیں۔“ وہ ہنسا۔  
”لیکن یہ جادو کا دیس نہیں۔ میرا گھر ہے۔“ انپکڑ جشید نے  
جھٹائے ہوئے انداز میں کہا۔

”آج سے آپ اپنے گھر کو بھی جادو کا دیس خیال کر لیں تو بہت  
افادہ ہو گا۔“ اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

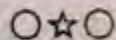
”افادہ ہو گا۔ میں کوئی بیمار ہوں کہ افادہ ہو گا۔۔۔۔۔۔ میں آ  
رہا ہوں۔۔۔۔۔۔ بچ سکتے ہو تو خود کو بچا لو۔“ یہ کہہ کر انہوں نے ایک بار پھر  
چھلانگ لگائی۔ اس بار اس نے حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی۔  
لہذا انپکڑ جشید پوری طرح اس سے کھرا گئے۔ ساتھ ہی ان کے منہ

سے ایک دلدوز چیخ نکل گئی۔ وہ فرش پر گرتے چلے گئے۔ لیکن وہ  
بے ہوش نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے کہ ان کی آنکھیں کھلی تھیں۔  
وہ سوچ سکتے تھے، دیکھ سکتے تھے۔ لیکن حرکت نہیں کر سکتے تھے۔  
انہوں نے دیکھا۔ وہ ان سے کچھ فاصلے پر پرسکون انداز میں کھڑا تھا۔  
ان کی فکر سے اس کا کچھ بھی نہیں بگڑا تھا۔ بس وہ ذرا سا اپنی جگہ  
سے اچھلا ضرور تھا۔ لیکن پھر اسی جگہ آکھڑا ہوا تھا۔

”میں نے کہا تھا۔۔۔ لیکن آپ نے میری بات نہیں مانی۔۔۔  
خیر۔۔۔ اب میں اپنا کام ختم کرتا ہوں۔ کافی دیر لگا دی میں نے۔۔۔ مسٹر  
جیرال ناراض ہوں گے۔ اگرچہ مجھے ان کی کوئی پروا نہیں۔“

انپکڑ جشید پوچھنا چاہتے تھے کہ وہ یہاں کس کام سے آیا  
ہے۔ کیا کرنا چاہتا ہے۔ اور وہ یہ بھی پوچھنا چاہتے تھے کہ اسے  
جیرال کی پٹائیوں میں، لیکن وہ ایسے پوچھ سکتے تھے۔ ان کی تو زبان  
ساکت تھی۔

انہوں نے دیکھا رائو ان کے لمبے لی طرف بڑھ رہا تھا۔





کامران مرزا فوراً جھکے اور فرش پر سے کوئی چیز اٹھا کر جیب میں رکھ لی۔۔۔ پھول بھی ان کی اسی جیب میں تھا اور وہ ایک خفیہ جیب تھی۔۔۔ اب وہ پرسکون انداز میں دروازے کی طرف بڑھے۔۔۔ اس وقت تک دو بار اور دستک دی جا چکی تھی۔

”کون ہے دروازے پر۔۔۔ اور اس قدر بدتمیزی سے کیوں دروازہ لپٹا جا رہا ہے۔۔۔“ وہ چلائے۔

”میں ہوں۔۔۔ فوراً دروازہ کھولیں۔۔۔ ورنہ وہ مجھے مار دیں گے۔۔۔“

”کون مار دیں گے؟“ وہ پوچھے۔

”میرے دشمن۔۔۔ باہر سے کہا گیا۔“

”اچھی بات ہے۔۔۔ میں دروازہ کھول رہا ہوں۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی انہوں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا اور خود اوٹ میں ہوتے چلے گئے۔

”ارے! آپ کہاں ہیں۔۔۔ لیکن میں باہر نہیں رک سکتا۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی ایک برے حال والا آدمی اندر آگیا اور خود ہی اس نے دروازہ بند کر دیا۔۔۔ اب اس نے انسپٹر کامران مرزا کو دیکھا۔

”معافی چاہتا ہوں۔۔۔ آپ کو زحمت دی۔۔۔ لیکن میں مجبور تھا۔“ اس نے جلدی جلدی کہا۔۔۔ سانس پھولا ہوا تھا۔

”مسئلہ کیا ہے۔۔۔ آپ یہ بتائیں۔“

## پھول کا معمہ

انہوں نے بیگم کی طرف دیکھا اور بیگم نے ان کی طرف گھبرا کر دیکھا۔

”شاید کھیل شروع ہو گیا ہے۔“ بیگم بولیں۔

”کھیل تو اس دہائی کے آتے ہی شروع ہو گیا تھا۔۔۔ یار لوگ ہمیں کھلونوں کی طرح استعمال کرنا چاہتے ہیں اور میں بھی خود کو مجبور پا رہا ہوں۔“

”کیوں! آپ کہیں مجبور پا رہے ہیں خود کو۔۔۔ نہ پڑیں اس جھیلے میں۔“

”کیسے نہ پڑوں۔۔۔ پھر پھول کا معمہ کس طرح حل ہو گا۔“

”نہ ہو گا تو آپ کی صحت پر کیا اثر پڑے گا۔“

”آخر بڑی بڑی طاقتیں کیوں پریشان ہیں۔۔۔ ایک پھول سے۔۔۔ یہ تو دیکھنا ہی ہو گا۔“

”اچھی بات ہے۔۔۔ آپ دیکھیں۔۔۔ مین باورچی خانے دیکھتی ہوں۔“ انہوں نے منہ بنایا اور باورچی خانہ کی طرف مڑ گئیں۔ انسپٹر

”جی ہاں۔ کیوں نہیں۔ ابھی بتاتا ہوں۔ ذرا میں سانس درست کر لوں۔“

”آئیے میرے ساتھ۔“

”لیکن میں خطرے میں ہوں۔ کسی لمحے وہ بھی یہاں آ جائیں گے۔“

”کیا انہیں معلوم ہے کہ آپ یہاں آئے ہیں۔“

”نہیں۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ میں اس علاقے کے کسی گھر میں چھپا ہوں۔ لیکن وہ یہ بات جانتے ہیں کہ میں اس علاقے میں ہی کسی گھر میں ہوں۔ اور ان کے لیے اس گھر کو تلاش کر لینا مسئلہ نہیں ہو گا۔“

”آئیے پہلے اطمینان سے بیٹھ جائیں۔ پھر بات کریں۔ جب تک آپ پوری بات مجھے نہیں بتائیں گے۔ بات پلے نہیں پڑے گی۔“

”جی ہاں! یہ بات تو ہے۔“

دونوں صحن میں آ کر بیٹھ گئے۔ چند سیکنڈ اس نے سانس درست کرنے میں لگائے پھر منہ کھولا۔

”وہ تین دن سے میرے پیچھے ہیں۔ کھنڈر کے غنڈے۔“

”کھنڈر کے غنڈے۔ یہ نام میں پہلی بار سن رہا ہوں۔“

”سن بھی کیسے سکتے ہیں۔ آپ کا بھلا ان معاملات میں سے

تعلق۔ آپ تو بس اتنا کریں کہ پولیس کو فون کر کے مجھے ان کے حوالے کر دیں۔ ایک بار میں جیل میں پہنچ گیا تو ان کے ہاتھ سے بچ جاؤں گا۔ یوں تو وہ مجھے جیل میں بھی نہیں چھوڑیں گے۔“

”اوہو۔ آخر وہ کون لوگ ہیں۔ اور کیا آپ جانتے ہیں۔ آپ کس کے گھر میں ہیں۔“

”سن۔ نہیں تو۔ میں تو بدحواسی کے عالم میں یہاں تک آ گیا ہوں۔ کچھ دیر باہر رکنے کا موقع نہیں ملا۔ کہیں میں ان کے ہی کسی ساتھی کے گھر میں تو نہیں آ گیا۔“

”نہیں۔ میرا کھنڈر سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ بتائیں۔ کھنڈر کون ہے۔“

”ایک بہت بڑا بد معاش۔ شہر میں اس کے بے شمار غنڈے ہیں۔ منشیات کا کاروبار کرتا ہے وہ۔ میں بھی اس کے گینگ میں شامل ہوں۔ لیکن اس کام سے اس حد تک تنگ آ چکا ہوں کہ اب یہ فیصلہ کر لیا ہے۔ گروہ کے لیے کوئی کام نہیں کروں گا۔ چاہے کچھ ہو جائے۔ چاہے ساری زندگی جیل میں سڑنا پڑے۔“

”اگر یہ بات ہے تو جان لیں کہ آپ کو ساری زندگی جیل میں نہیں سڑنا پڑے گا۔“ انسپکٹر کامران مرزا مسکرا دیئے۔

”جی۔ کیا مطلب۔ آپ کون ہیں؟“

”مجھے انسپکٹر کامران مرزا کہتے ہیں۔“



”کیا... نہیں۔“ وہ چلا اٹھا۔ اور پھر اس کی آنکھیں مارے خوف کے پھیل گئیں۔

”کیا بات ہے... تم خوف زدہ کیوں ہو گئے۔“

”اگر آپ انسپکٹر کامران مرزا ہیں۔ تب تو میں پھنس گیا۔“ اس نے لرز کر کہا۔

”کیا مطلب... یہ تم نے کیا بات کہی۔“

”یہ بات میں نے اس لیے کہی... کہ وہ راس بارہا مرتبہ کہ چکا ہے کہ وہ ہر ماہ ایک بڑی رقم بطور رشوت کے انسپکٹر کامران مرزا کو دیتا ہے۔“

”اوہو اچھا... اب ہم لوگوں نے یہ کام بھی شروع کر دیا ہے۔“ پتا نہیں جناب... ویسے اس کا کہنا ہے کہ آپ لوگ اوپر سے بہت پارسا بنتے ہیں... اندر سے تو آخر پولیس والے ہی ہیں... اور رشوت میں گردن تک دھنسنے ہوتے ہیں۔“

”یہ جان کر دکھ ہوا... اب تو اس کنڈر کو پکڑنا ہی ہو گا۔“

”آپ کیا پکڑیں گے اسے... آپ تو اس سے ہر ماہ ایک بڑی رقم وصول کرتے ہیں۔“

”وہ تمام رقمیں اسے واپس لوٹانے کے لیے تو ملاقات کرنا ہی ہو گی... اگر آپ واقعی تائب ہو چکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے چنگل سے نکل جائیں تو اس کے ٹھکانے کا پتا بتانا ہو گا... ہم اسی وقت

چھاپہ ماریں گے اور اسے گرفتار کر لیں گے... پھر آپ سلطانی گواہ بن جائیں... آپ جیل جانے سے بھی بچ جائیں گے۔“

”لیکن کیا فائدہ... جیل سے باہر آ کر وہ میرا جینا حرام کر دیں گے... آپ ان سب کو پھانسی تو لگوا نہیں دیں گے۔“ اس نے منہ بنایا۔

”جیل سے باہر آ کر بھی وہ آپ کو ہاتھ نہیں لگا سکیں گے... میں اس بات کا بھی آپ کو یقین دلا دوں گا۔“

”آخر کیسے؟“ اس نے ب یقینی کے عالم میں کہا۔

”میں اس نئے دروازے پر دروازہ تک ہوا۔“

”مجھے۔“ اس نے کانپ کر کہا۔

”آپ ڈراما تو نہیں کر رہے۔“ انہوں نے بغور اس کی طرف دیکھا۔

”ڈڈ... ڈراما... یہ آپ نے کیا کہا... مطلب یہ کہ میں آپ کے ساتھ دھوکا تو نہیں کر رہا... تو بہ تو بہ... آپ نے تو مجھے پناہ دی ہے... سچ یہی ہے کہ مجھے نہیں معلوم تھا... آپ کون ہیں۔“

”اچھی بات ہے... آپ اس کمرے میں چلے جائیں اور دروازہ اندر سے بند کر لیں... جب تک میں نہ کہوں... آپ دروازہ نہیں کھولیں گے۔“

”اچھی بات ہے۔“ اس نے فوراً کہا اور اس کمرے میں چلا

گیا۔ چنٹی لگنے کی آواز سن کر وہ دروازے کی طرف بڑھے۔

”کون ہے دروازے پر؟“

”کھنڈر کے غنڈے۔۔۔ اس مکان میں کسی نے پناہ لی ہے۔۔۔ آپ فوراً اسے نکال باہر کریں۔۔۔ ورنہ ہم اس گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔“

”شکر ہے۔۔۔ کوئی تو ایسا آیا۔۔۔ جو اس گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔۔۔ میں تو ترس گیا تھا ایسے کسی آدمی کو۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

”کیا مطلب؟“ باہر سے کہا گیا۔

”میں دروازہ کھول رہا ہوں۔۔۔ پہلے آپ اندر آکر تلاشی لیں۔۔۔ پھر بات کریں گے۔“

”اوہ تو وہ یہاں نہیں ہے۔“ باہر سے مایوسانہ انداز میں کہا گیا۔

”یقیناً کب کہا۔“ انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”کیا مطلب۔۔۔ تو کیا وہ یہاں ہے؟“

”ہاں ہے۔۔۔ بالکل ہے۔۔۔ میں دروازہ کھول رہا ہوں۔“ انہوں نے کہا۔

”بہت خوب۔۔۔ مطلب یہ کہ آپ اس کو ہمارے حوالے کر رہے ہیں۔“

”ہاں کیوں نہیں۔۔۔ میں تو اپنے آپ کو بھی آپ کے حوالے کر

دوں گا۔“ انہوں نے منہ بنایا۔۔۔ ابھی انہوں نے چنٹی نہیں کھولی تھی کہ باہر سے کسی نے کہا۔

”ارے باپ رے۔۔۔ یہ گھر تو انپکڑ کا مران مرزا کا ہے۔“

”اوہو اچھا۔۔۔ اگر یہ بات ہے تو اور بھی اچھا ہے۔ اس لیے

کہ یہ تو اپنے ہی آدمی ہیں۔۔۔ باس انہیں بھی تو آخر حصہ دیتا ہے۔“

”اوہ ہاں۔۔۔ واقعی۔“

اور اسی وقت دروازہ کھل گیا۔۔۔ پانچ غنڈے یکم دم اندر داخل ہو گئے۔۔۔ ان کے ہاتھوں میں پستول تھے۔۔۔ انہوں نے خونخوار نظروں

سے ادھر ادھر دیکھا۔۔۔ پھر ان کی طرف مڑے۔

”کہاں ہے وہ بزدل۔“

”سامنے دوسرے کمرے میں۔۔۔ میں نے آپ کے لیے بند کر رکھا ہے اے۔“

”بہت خوب! مرزا آگیا۔“

”میرے گھر میں تم لوگوں کو پستول ہاتھ میں لے کر آنے کی

ضرورت نہیں۔۔۔ پستول جیبوں میں رکھ لو۔“

”اوہ ہاں! آپ تو اپنے ہی آدمی ہیں۔“

”بالکل بالکل۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولے۔

انہوں نے پستول جیب میں رکھ لیے۔۔۔ انپکڑ کا مران مرزا نے

انہیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولے۔



”ویسے اس کا مسئلہ کیا ہے۔“

”مسئلہ کیا ہوتا۔ باغی ہو گیا ہے۔ گینگ کے بارے میں پولیس کو بتانے پر قتل کیا ہے۔ اور کہتا ہے، اب یہ کام نہیں کرے گا۔ آپ ذرا سوچیں۔ یہ کام نہیں کرے گا تو جیل میں جائے گا۔ اس کے گھر والے کیا کھائیں گے۔ یہ بات نہیں سوچتا۔“

”اب سوچے گا۔ جب آپ اسے لے جائیں گے۔ نیم مسمانوں کے لیے اسپیشل چائے۔“ انہوں نے ہانک لگائی۔

”اس کی ضرورت نہیں۔“ ان میں سے ایک بولا۔

”پہلی بار میرے گھر میں کنڈر کے آدمی آئے ہیں اور چائے پئے بغیر چلے جائیں۔“

”اوہ اچھا۔ آپ کی مرضی۔“

عین اس وقت اس کمرے کے اندر سے اس شخص نے دروازہ پینٹا شروع کر دیا۔ ساتھ وہی وہ چلائے لگا۔

”انسپکٹر کامران مرزا۔ تم نے مجھے دھوکا دیا۔ تم نے کیا کہا تھا۔ اب تم مجھے ان جلادوں کے حوالے کر رہے ہو۔ یہ مجھے کچا چ جائیں گے۔ تم بھی ان میں سے ایک ہو۔ تمہیں اس ظلم کی سزا ملے گی۔ خدا تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ ایک شخص جو گناہوں سے توبہ کرنے پر قتل کیا۔ تم اسے غنڈوں کے حوالے کر رہے ہو۔ جبکہ تمہیں چاہیے تھا کہ تم اسے بچاتے اور غنڈوں کو قانون کے

حوالے کرتے۔ افسوس۔ جن کا اتنا نام سنا تھا۔ وہ بھی اندر سے لیا نکلا۔“

”دیکھا آپ نے۔ کیسے تڑپ رہا ہے۔“

”اس کا تڑپنا اور پھر کتنا ابھی نکل جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔“

اور پھر ہادوری صوفی کمرے کے سامنے مرزا کا کچرا گھر۔ ان کے ہاتھوں کے لیے چائے کی بوتلیں۔ اپنے لیے۔ بنائی۔

”آپ نہیں بیٹھ گئے؟“

”نہیں۔ میں صرف اپنے وقت پر بیٹھا ہوں۔“

وہ چائے پینے لگے۔ اچانک کپ ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گئے اور وہ کرسیوں سے گر کر فرش پر ڈھیر ہو گئے۔ اب انسپکٹر کامران مرزا مسکراتے ہوئے اٹھے اور کمرے کے دروازے پر پہنچ کر بولے۔

”لو۔ اب اپنا شکار۔“

یہ کہہ کر انہوں نے دروازہ کھول دیا۔

”تمہیں کس قدر برے ہو۔“ اندر موجود شخص بس اتنا کہہ سکا۔ پھر اس کی نظر پانچ بے ہوش غنڈوں پر پڑی۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”بھنا گئے تھے۔ پریشان ہو گئے تھے۔ میری بات پر یقین نہیں

”کیا تھا۔“ انیکٹر کامران مرزا نے برا سامنہ بناتے ہوئے کہا۔

”ممہ۔ میں۔ میں معافی چاہتا ہوں۔“

”خیر کوئی بات نہیں۔“

اب انہوں نے دفتر فون کیا۔ وہاں سے سب انیکٹر رضوان فوراً ان کے پاس پہنچ گیا۔ انہوں نے اسے ایات دے دی۔ وہ باجوا فٹنوں کو اٹھائے گیا۔ اب انہوں نے اس شخص کے چرب پر سبک اپ شروع کیا۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“

”جی میں ثونی ہوں۔“

”لیکن اب تم خالد ہو۔ اپنے گھر والوں کو لے کر کہیں دور نکل جانا۔ کھنڈر کے غنڈے کئی سال بعد جیل سے نکل سکیں گے۔ اس وقت تک لوگ تمہارے بارے میں بالکل بھول چکے ہوں گے اور کوئی انہیں تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتا سکے گا۔ نہ کوئی تمہیں پہچان سکے گا۔“

”لیکن کیسے نہیں پہچان سکے گا۔“

”بس دیکھتے رہو۔“

”لیکن کھنڈر کے غنڈے تو سو کے قریب ہیں۔ جب کہ آپ نے صرف پانچ کو گرفتار کیا ہے۔“

”ان پچانوے کو بھی ان کے پاس سمیت آج رات گرفتار کر لیا

جائے گا۔ تم میرے ساتھ ہو گے۔ لیکن وہ تمہیں پہچان نہیں سکیں گے۔ وہ یہی خیال کریں گے کہ تم میرے کوئی ساتھی ہو۔“

”یہ کیسے ہو گا۔“

”تھوڑی دیر تک معلوم ہو جائے گا۔“

ایک گھنٹے بعد اس کی شکل و صورت بالکل بدل گئی تھی۔ وہ خود دیکھ رہا تھا۔

”اب تو کھنڈر کا باپ ہی مجھے نہیں پہچان سکے گا۔“

”یہ تمہاری غلطی ہے۔“ انیکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

”جی۔ کیا مطلب۔ کون سی غلطی؟“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”یہ کہنے سے پہلے آواز بھی بدل لی ہوتی۔ آواز سن کر وہ ضرور پہچان لے گا۔ رات کو ہم اس کے ٹھکانے پر چھاپہ ماریں گے۔ وہاں تم منہ سے آواز ہرگز نہ نکالنا۔ کیونکہ تم کامیابی سے آواز نہیں بدل سکو گے۔“

”بہت بہتر۔“

”اب اسی وقت دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ گھبرا گیا۔ لیکن انیکٹر کامران مرزا کو پرسکون دیکھ کر اسے حوصلہ ہوا۔

”گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرے بچے آئے ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ دروازے پر گئے اور چٹخنی گرا دی۔ دوسرے ہی لمحے



وہ سکتے میں آ گئے۔۔۔ دروازے پر آفتاب، آصف اور فرحت نہیں۔۔۔  
کوئی اور موجود تھا۔

○☆○

## ایک خبر

وہ راتوں کو اپنے کمرے کی طرف جاتے دیکھتے رہے۔۔۔ وہ بالکل  
بے بس تھے۔۔۔ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ صرف دیکھ سکتے تھے۔ یا سن  
سکتے تھے۔ صرف پندرہ منٹ بعد وہ مسکراتا ہوا باہر آ گیا اور ان کی  
طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”آج کی فکست بھی آپ کو یاد رہے گی۔۔۔ دیکھ لیں۔۔۔ میں  
آپ لوگوں کو فکست پر فکست دیتا چلا آ رہا ہوں۔۔۔ کاش!“ وہ کہہ کر  
رک گیا۔۔۔ مسکرایا اور پھر کہنے لگا۔

”اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں کاش کے بعد کیا کہنا  
چاہتا ہوں۔۔۔ صرف یہ کہ کاش میرے پاس عقل بھی مسٹر جبریل اور  
ابنقال جیسی ہوتی۔۔۔ پھر مجھے ان لوگوں کا بھی پاس بنا دیا جاتا۔۔۔ اچھا  
اب میں جاتا ہوں۔۔۔ جو کام کرنے کے لیے آیا تھا۔۔۔ کر چکا ہوں۔۔۔  
لہذا اب جانا ہی ہو گا۔“

ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ دروازے کی طرف بڑھا۔۔۔ دروازے  
پر پہنچ کر مڑا اور بولا۔

”گجرات کی ضرورت نہیں۔ صرف ایک گھنٹے کے بعد آپ لوگ ہلے جلنے کے قاتل ہو جائیں گے۔“

”وہ چلا گیا۔ ایک گھنٹہ بعد ان میں ہلے جلنے کے آثار نمودار ہوئے اور آخر آہستہ آہستہ وہ سب اپنے آپ میں آگئے۔“

”اف مالک! یہ سب کیا تھا؟“ خان رحمان نے کانپ کر کہا۔

”ایک خواب۔ جو ہم سب نے ایک ساتھ دیکھا۔“ انکپٹر

جیشہ مسکرائے۔

”نہ۔ لیا ایسا ہو سکتا ہے بیشید۔“ پروفیسر داؤد بولے۔

”کیا ہو سکتا ہے۔“ انہوں نے ان کی طرف دیکھا۔

”ہم سب مل کر ایک خواب دیکھ سکتے ہیں۔“

”ہا نہیں۔ اس وقت تو یہی محسوس ہو رہا ہے۔“

”آخر یہ شخص کیا چیز ہے۔ جسے تم چھو بھی نہیں سکتے۔“

”ہا نہیں۔ یہ انسان ہے بھی یا نہیں۔ کہیں یہ کوئی روبوٹ

نہ ہو۔“

”لیکن بھئی۔ ایک روبوٹ اس قدر تیزی سے تو حرکت نہیں

کر سکتا۔ جیسے کوئی ہلکا پھلکا بچہ۔“

”ابھی اس سے اور ملاقاتیں ہوں گی۔ اس وقت دیکھیں

گے۔ یہ کیا ہے۔ اس وقت تو مسئلہ ہے اس معاملے سے بچنے کا۔

آئیے دیکھیں۔ وہ میرے کمرے میں کیا کر گیا ہے۔“

”کر کیا ہو گا۔ کسی فائل کی مائیکرو فلم بنا کر لے گیا ہو گا۔“ محمود نے برا سامنے بنایا۔

”نہیں۔ اتنے سے کام کے لیے یہ شخص نہیں آ سکتا تھا۔ یہ انشارجہ یا بیگل میں خاص مقام رکھتا ہے۔ کوئی عام آدمی نہیں ہے۔“

سنا نہیں تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ کاش اس کے پاس جبرال یا ابطال جیسی اصل بھی ہوتی تو وہ ان کا بھی اس وقت پاس ہوتا، مطلب یہ کہ تو یہ

شخص صرف اصل کے میدان میں ان سے قدرے پیچھے ہے۔ لڑائی جبرالی میں ان سے دو ہاتھ آگے ہے۔ کہہ سکتے ہیں ان لوگوں سے

مقابلہ کرنے میں اب تک ناکام نہیں رہے۔ جب کہ اس سے مقابلہ کری نہیں سکتے۔ اور شکست پر شکست کھا چکے ہیں۔“

”بالکل فکر نہ کرو جیشہ۔ آئندہ مہم میں اگر یہ تمہارے سامنے آیا تو تم اس سے بخوبی مقابلہ کر سکو گے، اس لیے کہ میں نے اسے

دیکھا ہے۔ یہ کون ہے۔ کیا ہے۔ کیا کر سکتا ہے۔ اور اب میں اس سے جنگ کی باقاعدہ تیاری شروع کروں گا۔ لہذا تم مجھے اجازت

دو۔ خان رحمان کو بھی میں ساتھ لے جا رہا ہوں۔ ہم دونوں مل کر کام کریں گے۔ پھر تمہیں اطلاع دیں گے۔“

”ابھی بات ہے۔“

وہ کمرے میں آگئے۔ انہوں نے فائیکوں والی الماری کا ہندسوں والا تالا کھول ڈالا۔ دوسرے ہی لمحے وہ کانپ گئے۔ الماری کے اندر



کا منظر صدر صاحب کی الماریوں کے منظر سے مختلف نہیں تھا۔۔۔ جو حشر وہاں دیکھنے میں آیا تھا۔ بالکل وہی حشر یہاں بھی تھا۔ تمام فائلیں راکھ میں تبدیل ہو چکی تھیں۔

”ارے باپ رے۔ یہ الماری تو صرف راکھ سے بھری ہوئی ہے۔“

”ہاں! میری تو صرف ایک الماری ہے۔ صدر صاحب کی ایسی مجھے الماریاں راکھ سے بھری ہوئی ملی ہیں۔“

”حق نہیں۔“ وہ اُپ گئے۔

”رائٹر کے مقابلے میں ہمیں دانتوں پینہ آئے گا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس بات کا سو فیصد یقین ہے۔“

”ہوں خیر۔ کیا اب ہم جائیں۔“

”ہالدا! آپ جائیں۔ اس کے خلاف جنگ کی تیاری کے لیے جو بھی کر سکتے ہیں کر ڈالیں۔ ہمیں اب جوابی حملہ کرنا ہو گا۔ اس کے دوسرے حملے کے انتظار سے یہ کہیں بہتر ہے کہ اب ہم اس پہ حملہ کریں۔“

”ایسا ہی ہو گا جشید۔ تم فکر نہ کرو۔“

اور وہ خان رحمان کو ساتھ لے کر چلے گئے۔ دوسرے دن کے اخبارات نے ان کے ہوش اڑا دیئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کسی دن ایسی خبریں بھی سننے کو ملیں گی۔ خبر یہ تھی۔

”صدر مملکت اور انسپٹر جشید پر بدعنوانیوں کے سنگین الزامات۔۔۔ دونوں نے اپنے سارے ریکارڈ جلا کر راکھ کر دیئے۔“

نیچے تفصیل کچھ یوں تھی:

”اسمبلی کے اجلاس میں چند بڑے لیڈروں نے صدر صاحب اور ان کے اشاروں پر ٹاپے والے انسپٹر جشید پر بدعنوانی کے تیکڑوں الزام لگائے تھے۔ ان الزامات سے ٹاپے کے لیے دونوں نے اپنے پاس موجود تمام فائلوں کو راہ کے میں تبدیل کر دیا۔ تاکہ ان کے خلاف کسی کو کوئی ثبوت نہ مل سکے۔ لیکن وہ بھول گئے۔ کہ وہ راکھ ہی تو سب سے بڑا ثبوت بھی ہے۔ عوام ان سے سوال کرتے ہیں۔۔۔ آخر انہوں نے ریکارڈ کو کیوں جلایا۔۔۔ ریکارڈ تو قوم کی امانت تھی۔“

ابھی وہ یہ خبر پڑھ کر فارغ ہوئے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔۔۔ انہوں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف صدر صاحب تھے۔ اور کہہ رہے تھے۔

”تم نے یہ خبریں پڑھی جشید۔“

”ہاں سروس۔ ابھی ابھی پڑھی ہیں۔“ وہ بولے۔

”اب کیا ہو گا؟“ ان کی سرسراہٹ آواز کانوں میں گونجی۔

”ہم تیل دیکھیں گے، تیل کی دھار دیکھیں گے۔“ انسپکٹر جمشید نے پرسکون آواز میں کہا۔

”لیکن اتنی دیر میں دوسرے ہم پر چھا جائیں گے۔ کیا تم بھول رہے ہو۔ اس معاملے میں کن لوگوں کا ہاتھ ہے۔ یہ صرف ہمارا ملکی مسئلہ تو ہے نہیں۔“ وہ جلدی جلدی بولے۔

”مات تو ہے۔ لیکن فی الحال تو ہم کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔“

”اوہو جمشید۔ افس۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔“

”کیا ہوا سر؟“ انسپکٹر جمشید گھبرا گئے۔

”افسوس! اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ شاید تم بھی اب کچھ نہیں کر سکو گے۔ ویسے آسکتے ہو تو فوراً ایوان صدر میں آ جاؤ۔ ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر آ جاؤ۔“

”ہو! کیا ہے؟“

لیکن دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا۔ وہ دھک سے رہ گئے۔

”ایوان صدر میں کوئی خوفناک گڑبڑ ہے۔ تم لوگ یہیں ٹھہرو۔ صرف میں وہاں جاؤں گا۔ صدر صاحب مجھے بلا رہے ہیں۔“

ان الفاظ کے ساتھ ہی انہوں نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ لیکن دروازے پر پہنچتے ہی رک گئے۔ عین اسی لمحے کسی نے دروازہ بست

نوردار انداز میں دھڑ دھڑا دیا تھا۔

”کون ہے باہر؟“ انہوں نے جھلا کر کہا۔

”فوج۔ آپ کی گرفتاری کے وارنٹ ہیں ہمارے پاس۔“

”لیکن میری گرفتاری سے فوج کا کیا تعلق؟“

”فوج کو ملک کی حفاظت کرنی ہے۔ بس یہ تعلق ہے۔“

”کیا میں نے اپنے ملک کے خلاف کوئی کام کیا ہے۔“

”ہاں! اثرات کے جوابات دینے کے بجائے ریکارڈ کو جلا دیا۔“

”کیا یہ ملک سے غداری نہیں۔“

”میں نے کوئی ریکارڈ نہیں جلایا۔ نہ صدر صاحب نے ریکارڈ

جلایا ہے۔ یہ کوئی بہت گہری سازش ہے۔“

”آپ اپنے خلاف عدالت میں بیان دے سکتے ہیں۔ اپنی صفائی

میں جو کچھ کہنا چاہیں کہہ سکتے ہیں۔“

”اچھی بات ہے۔ میں سمجھتا ہوں، آپ سے کچھ کہنے کا کوئی

فائدہ نہیں۔ لیکن آپ مجھے وارنٹ کے بغیر گرفتار نہیں کر سکیں

گے۔ وارنٹ آپ کو دکھانا ہو گا۔“

”میں نے کمانڈ وارنٹ ہیں ہمارے پاس۔“ باہر سے چلا کر کہا

”کیا۔“

”ایک بات اور۔ مجھ پر اور صدر صاحب پر تو سرے سے کوئی

الزام لگایا ہی نہیں گیا، جوابات کس بات کے دیتے۔“



”تب پھر گرفتاری کے لیے میرے علاقے کے پولیس آفیسر کو بھیجا جائے۔۔۔ ملک میں مارشل لاء نہیں لگا ہوا کہ فوج مجھے گرفتار کرے۔“



تھے اور اپنی خفیہ فورس کو فون پر ہدایات دے چکے تھے۔

”اب کیا ہو گا جمشید؟“ پروفیسر داؤد نے پریشان آواز میں کہا۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

میں مانتا ہوں۔ سازش بہت زبردست ہے۔ اور میرے یا صدر

صاحب کے خلاف نہیں۔ بلکہ پورے ملک کے خلاف ہے۔ عاج

سوچتا ہو گا۔ ورنہ پھر ملک اس سازش کا شکار ہو جائے گا۔ ہمسد کہ

میرا خیلا ہے۔ صدر صاحب کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اور ملک

میں شاید اب تک مارشل لاء لگایا جا چکا ہو گا۔“

”اف مالک۔ یہ ہم کیا سن رہے ہیں۔“

”تھوڑی دیر تک میرے آدمی صدر صاحب کے بارے میں

اطلاع دیں گے۔“

”کیا فون پر اطلاع وصول کرنا ہمارے لیے خطرناک نہیں ہو گا

جمشید؟“ پروفیسر داؤد بولے۔

”بالکل ہو گا۔ لیکن ہم مجبور ہیں۔ فوج ہمارے اس ٹھکانے کا

سراغ لگا لے گی۔ لیکن اس وقت تک ہم ٹھکانہ بدل چکے ہوں

گے۔ اطلاع ملنے کے ساتھ ہی ہم کہیں اور چلے جائیں گے۔ اور

اس بار ایسی جگہ جائیں گے۔ کہ وہ سراغ نہیں لگا سکیں گے۔“

”اوہ اچھا۔ تب تو ٹھیک ہے۔“ خان رحمان نے کہا۔

”لیکن جمشید۔ ہمارے باقی سب دوستوں کے فون ٹیپ ہو چکے

ہوں گے۔ ہم اب انسپکٹر کامران مرزا اور شوکی برادرز کو بھی فون نہیں

کر سکتے۔ نہ اپنے کچھ اور دوستوں کو فون کر سکتے ہیں۔“

”وہ خود یہاں آ جائیں گے۔ اور ہم سے رابطہ کر لیں گے۔“

آپ پریشان نہ ہوں۔“

عین اس وقت فون کی گھنٹی بجی۔

”سر! صدر صاحب کو گرفتار کرنے نامعلوم مقام پر چا دیا گیا۔“

ہم کوشش کے باوجود ان سراغ نہیں لگا سکے۔ اگر ہمیں صرف آدھ

گھنٹے پہلے ان کی گرفتاری کی اطلاع مل جاتی تو ہم سراغ لگا لیتے۔ لیکن

جب ہمیں اطلاع ملی۔ اس وقت تک انہیں وہاں پہنچایا جا چکا تھا۔“

”اوہ! یہ تو برا ہوا۔ یہ لوگ ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں

کریں گے۔ خیر تم برابر سراغ لگانے کی کوشش کرتے رہو۔ میں خود

تم لوگوں کو فون کروں گا۔ اب تم مجھے فون نہیں کرو گے۔“

”او کے سر۔“ اس نے جواب دیا۔

”جیسے۔ اب یہ جگہ بھی ہمارے لیے غیر محفوظ ہے۔“

وہ وہاں سے نکل کر ایک دوسرے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ کار کے

نمبر انہوں نے پہلے ہی تبدیل کر لیے تھے۔ اور ملے بھی ریڈی میڈ

میک اپ کے ذریعے تبدیل کر لیے تھے۔ اس ٹھکانے پر پہنچ کر انہوں

نے سب کے چہرے پختہ میک اپ سے بدل ڈالے۔ کیونکہ اب وہ

اپنے ایک خفیہ فورس کے کارکن کے گھر میں تھے۔ اور یہاں کوئی



ملاتی آسکا تھا۔

اب انہوں نے ایک ماتحت کو فون کو فن کیا۔

”ہاں افضل سبزی لے آئے۔“ وہ کوڑ میں بولے۔

”جی ہاں۔۔۔ بالکل لے آیا۔۔۔ آپ کے پڑوسی بھی شدید بیمار ہو گئے ہیں۔“

”اوہ! آپ نے خندیں دکھتا ہوں۔ تم جلدی سے کھانا تیار کر۔“

”لیس سر۔“

یہ باتیں آوازیں بدل کر کی گئی تھیں۔۔۔ فون کا ریسیور رکھ کر وہ ان کی طرف مڑے۔

”ایک پریشان کن خبر“۔ وہ بولے۔

”اور وہ کیا ہے؟“

”تے چاہتے غلام رسول کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔“

”اوه لیکن ان کا کیا قصور؟“

”ہمیں اپنے مکان کے راستے فرار کیوں ہونے دیا انہوں نے۔۔۔  
 میں الزام عائد کیا ہو گا۔۔۔ حالانکہ اس بے چارے کو اس وقت تک کچھ  
 معلوم نہیں تھا۔۔۔ سوال یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں اس کے لیے۔“

”چھڑنا ہو گا انہیں۔۔۔ ہماری لوج سے وہ کیوں مصیبت میں  
 برس۔۔۔“ محمود نے کہا۔

”اوکے۔۔۔ تم لوگ یہاں ٹھہرو۔۔۔ میں انہیں لے آتا ہوں۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو جمشید۔ تم کیسے چھڑا لاؤ گے بھلا۔“ پروفیسر داؤد گھبرا گئے۔

”کچھ نہ کچھ تو کرنا ہو گا۔۔۔ ورنہ غلام رسول صاحب ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے۔“

”اچھی بات ہے۔ تو پھر جاؤ۔ لیکن صدر صاحب کا کیا ہو گا۔“

”میرے آدمی اس جگہ کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔۔۔ جو نئی سراغ ملا۔ وہ انہیں وہاں سے نکال لانے کی پوری کوشش کریں گے۔ اگر نہ لاسکے تو بھی حالات تو فوراً بتائیں گے۔“

عین اس وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔۔۔ وہ چونک اٹھے۔

”یہ نمبر ۳ ہے سو۔۔۔ یعنی افضل۔“

”اوہ اچھا“۔ وہ پرسکون ہو گئے۔

جلد ہی ان کا ماتحت افضل کو ساتھ لیے اندر آگیا۔۔۔ وہ یہ دیکھ کر خوش ہو گئے کہ اس کے ساتھ غلام رسول صاحب بھی تھے۔

”بہت خوب۔۔۔ یہ کام دکھایا ہے تم نے۔“

”انہیں کسی خفیہ جگہ نہیں رکھا گیا تھا تاہم۔۔۔ اس لیے یہ نہیں لے آئے۔۔۔ صدر صاحب کو انہوں نے بہت خفیہ مقام پر رکھا

”لیکن تم اس مقام کا سراغ لگانے کی سر توڑ کوشش کرتے رہو۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ ہم لگاتار کوشش کر رہے ہیں۔“ اس نے فوراً کہا۔

”ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔“

اس کے جانے کے بعد وہ غلام رسول کی طرف مڑے۔ ان کا چہرہ دھوں ہو رہا تھا۔

”یہ کیا ہوا جشید صاحب؟“ وہ بولے۔

”سب کچھ اچانک ہوا ہے۔ ہمیں سوچنے اور سمجھنے کی ذرا بھی مہلت نہیں مل سکی۔ ہم اگر آپ کی چھت کے راستے فرار نہ ہوتے تو اس وقت ہمیں بھی نامعلوم مقام پر پہنچا دیا گیا ہوتا۔ اگر یہ معاملہ صرف اور صرف ہماری حکومت کا ہوتا تو ہم خود اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دیتے۔ اور عدالت میں جا کر صفائی دیتے۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ لوگ صدر صاحب کو قانون کے حوالے نہیں کریں گے۔ میرا مطلب ہے۔ عدالت میں نہیں کریں گے اور یہ کوئی انصاف نہیں ہے۔ لہذا اس معاملے میں ہمیں خود کو گرفتاری سے بچنا ضروری ہو گیا تھا۔ وہ گیا آپ کا مسئلہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ آپ کو بھی گرفتار کر لیں گے۔ خیر۔ ہم آپ کو تو نکال لائے۔ اب فکر ہے تو صرف اس بات کی کہ کہیں وہ آپ کے گھر

والوں کو پریشان نہ کریں۔ اس کا عمل میرے ذہن میں یہ آیا ہے کہ انہیں بھی یہیں لے آیا جائے۔“

”اور کیا خبر۔ اس وقت تک وہ انہیں گرفتار بھی کر چکے ہوں۔“

”نہیں۔ وہ ابھی ایسا نہیں کریں گے۔ وہ چاہیں گے کہ ہم انہیں وہاں سے نکال لانے کے لیے جائیں اور وہ ہمیں گرفتار کر لیں۔ جب وہ اہل رسی طرف سے مایوس ہو جائیں گے، اس وقت انہیں گرفتار کریں گے۔“

”گویا ہمیں ان لوگوں کو نکال لانے کے لیے اب حرکت میں آنا پڑے گا۔ میری فورس کو اب میدان عمل میں پڑے گا۔ ہم نے آج تک اپنے ملک کی پولیس یا فوج پر نہ تو کوئی چلائی۔ نہ ہاتھ اٹھایا۔ نہ میں ایسا چاہتا ہوں۔ اس لیے کہ ان لوگوں کا کوئی قصور نہیں۔ یہ تو بس حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ قصور تو ان سازشیوں کا ہے۔ جو ہمارے ملک کو آئے دن کسی نہ کسی مشکل سے دوچار کرتے رہتے ہیں۔“

”لیکن اس بار یہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔“

”یہ بات ایک آدھ دن تک سامنے آ جائے گی۔“

اب انہوں نے پھر فون اپنی طرف سرکایا۔ لیکن ابھی ریسیور نہیں اٹھایا تھا کہ فون کی کھٹی بج اٹھی۔ وہ بہت زور سے اچھلے۔



کیا مطلب

آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔

○☆○

انہوں نے دیکھا۔ وہ ایک لمبے قد کا چوڑا چکلا آدمی تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے تحاشہ چمک تھی۔ اس کے پیچھے چار غنڈہ صورت آدمی موجود تھے۔

”کیا بات ہے؟“ انسپکٹر کامران مرزا نے جھلا کر کہا۔  
”مجھے کنڈر کہتے ہیں۔ میرا آدمی ٹوٹی اس گھر میں آیا ہے۔۔۔  
پہلے ہم نے اس کا سراغ لگایا، پھر دستک دی۔ ہماری معلومات ہرگز غلط نہیں ہو سکتیں۔“

”میں نے کب کہا کہ معلومات غلط ہیں۔۔۔ وہ آیا ضرور تھا، خیر آپ گھر کی تلاشی لے لیں۔“

”آپ لوگ ایک طرف ہو جائیں۔ ہمیں آپ سے کوئی غرض نہیں، ہم تو بس ٹوٹی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔“

”وہ اگر یہاں ہے تو آپ اسے لے جائیں۔“ انہوں نے راستا دیتے ہوئے کہا۔

ان کے اندر داخل ہونے پر انہوں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا

”یہ کیا۔۔۔ آپ نے دروازہ کیوں بند کیا۔“

”آپ اطمینان سے پہلے اپنے ساتھی کو تلاش کر لیں۔۔۔

دروازے کا کیا ہے۔۔۔ کسی وقت بھی کھولا جاسکتا ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔۔۔ آپ کا نام کیا ہے؟“

”کیا آپ نے باہر لگی ٹام کی تختی نہیں پڑھی؟“ انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ اتنا وقت نہیں ملا۔“ وہ مسکرایا۔

انپکٹر کامران مرزا سمجھ گئے کہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں۔۔۔ وہ

کون ہیں۔۔۔ پھر بھی ادھر ادھر کی ہانک رہے تھے۔

”مجھے انپکٹر کامران مرزا کہتے ہیں۔۔۔ اگرچہ آپ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”اوہو اچھا۔۔۔ یہ اندازہ لگا لیا آپ نے۔۔۔ خوش ہوئی۔ اب

آپ بتائیں۔۔۔ وہ دیہاتی کہاں ہے؟“

”کون سے دیہاتی کی بات کر رہے ہیں؟“

”وہی جو پھول لایا تھا۔“

”وہ تو جا چکا ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”اور یہ کون ہے؟“ انہوں نے ثانی کی طرف دیکھا۔

”یہ۔۔۔ یہ میرے مہمان ہیں۔“

”ہوں اچھا۔۔۔ وہ پھول کہاں ہے۔۔۔ جو دیہاتی لایا تھا؟“

”آپ اپنے ساتھی کی تلاش میں آئے ہیں یا اس پھول کی تلاش میں۔“

”ساتھی تو پہلے ہی باغی ہو چکا ہے، اس کا ہم کیا کریں گے۔۔۔

آپ تو بس ہمیں وہ پھول دے دیں۔“

”اور اس پھول سے مسٹر کنڈر کا کیا تعلق ہے۔“

”ان کی خدمات اس پھول کو حاصل کرنے کے لیے حاصل کی گئی ہیں۔“

”یہ سن کر حیرت ہوئی۔۔۔ کہ ایک پھول کو حاصل کرنے کے لیے اتنے اہم آدمی کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔“

”وہ پھول بھی تو کم اہم نہیں ہے۔۔۔ پوری دنیا میں ایسا پھول آپ کو کہیں نہیں ملے گا۔“

”لیکن یہ کہاں سے آگیا؟“

”پوری دنیا ہی تو معلوم کرنے کے چکر میں ہے کرنے کے چکر

بس یہ کہ رام پونی کے باغ میں کھلنے والا پھول کہاں سے آگیا۔۔۔ انہوں

نے خود تو وہ پودا لگایا نہیں تھا۔“

”میں سمجھ گیا۔۔۔ تم جاؤ اور اپنے پاس سے کہہ دو۔۔۔ ہم پھول کا

راز معلوم کرنے کے لیے نکل رہے ہیں۔۔۔ زیادہ ڈرامے کی ضرورت

نہیں۔“







ہیں۔۔۔ ہے کوئی تک۔۔۔ آفتاب نے جل کر کہا۔

”اگر تمہارا جانے کو جی نہیں چاہ رہا تو تم یہیں رہ جاؤ۔“

”یہی تو مصیبت ہے۔“ وہ بولا۔

”کیا مطلب۔۔۔ کیسی مصیبت۔“

”میرا بھی جانے کو بے تحاشہ جی چاہ رہا ہے۔۔۔ بلکہ مارے پس کے برا حال ہے۔“

”حد ہو گئی۔۔۔ جانے کو بے تحاشہ جی بھی چاہ رہا ہے اور جان ہی نکلی جا رہی ہے۔“

”بھئی میں نے جان نکلنے کی بات نہیں کی تھی۔۔۔ تیل دیکھنے اور دل کی دھار دیکھنے کی بات کی تھی۔“ آفتاب نے تملاکر کہا۔

”یہ باتیں ہم سفر کے دوران کر لیں گے۔۔۔ آؤ چلیں۔“

”حد ہو گئی۔۔۔ نہ کھانا کھایا۔۔۔ نہ سفر کا سامان ساتھ لیا اور فرما ہے ہیں آؤ چلیں۔“ بیگم کامران مرزا نے جل بھن کر کہا۔

”اوہ ہاں! یہ تو ہم بھول ہی گئے۔۔۔ تو پھر پہلے کھانا اور پھر سامان اور اس کے بعد سفر۔“

تھوڑی دیر بعد وہ سفر پر روانہ ہو رہے تھے۔ انہیں گھر سے ابھی چند گھنٹے نہیں ہوئے تھا کہ فون کی کھنٹی بجی۔ بیگم کامران

مرزا نے ریسیور اٹھالیا اور بولیں۔

”جی فرمائیے۔۔۔ کس سے ملتا ہے۔“

”ہمیں جانا چاہا ہوں۔۔۔ اس بھول کا چکر کیا ہے۔۔۔ اس کے لیے ہمیں اس محل میں جانا ہو گا۔“

”ہمیں تو یہ کوئی جال لگتا ہے۔“ آصف بیڑیا۔

”ہاں! ہے تو یہ جال ہی۔۔۔ لیکن اس انداز میں بچھایا گیا ہے کہ ہم اس میں پھنسنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔“

”تو پھر بسم اللہ کریں۔“ آفتاب نے منہ بنایا۔

”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔“ انکپٹر کامران مرزا بولے۔

”کیا مطلب۔۔۔ کیا اسی وقت چلتا ہے۔“

”ہاں اور کیا۔۔۔ اب یہاں رک کر کیا کریں گے۔“

”لیکن وہ علاقہ شار جستان کا ہے۔“ فرحت نے پریشان آواز میں کہا۔

”جانتا ہوں۔۔۔ پھر بھی جانے پر مجبور ہوں۔۔۔ لیکن ہم قانونی انداز میں چلیں گے۔۔۔ اپنے پاسپورٹوں کے بل پر شار جستان میں داخل ہوں گے۔“

”اس طرح تو ہر قدم پر ہماری نگرانی کی جائے گی اور ہو سکتا ہے۔۔۔ اس محل کی طرف نہ جانے دیا جائے۔“

”کوئی بات نہیں۔۔۔ ہم تیل دیکھیں گے۔۔۔ تیل کی دھار دیکھیں گے۔“

”ایک تو آئے دن ہمیں تیل اور تیل کی دھار دیکھنے پڑ جاتے



”انسپکٹر جشید صاحب کی خفیہ فورس کا ایک ماتحت بات کر رہا ہوں۔“

”اوہ اچھا۔۔۔ خیر تو ہے۔“ وہ چونکیں۔

”اس طرف خیریت نہیں ہے۔۔۔ حالات حد درجے خطرناک ہیں۔۔۔ انسپکٹر صاحب۔۔۔ ان کے بچے اور دوست سب مشکل میں ہیں۔۔۔ انسپکٹر کامران مرزا صاحب، آصف آفتاب اور فرحت صاحبان کی بھی یہاں فوری طور پر ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔“

”افسوس! یہ اطلاع اگر چند گھنٹے پہلے مل جاتی تو میں انہیں روانہ کر سکتی تھی۔۔۔ اب نہیں۔“

”جی۔۔۔ کیا مطلب؟“

”چند گھنٹے پہلے وہ سفر پر روانہ ہو چکے ہیں اور اب ان کا جہاز شارجہستان کے ایئرپورٹ پر اتر چکا ہو گا۔“

”تو پھر کیا ہوا۔۔۔ انہیں وہاں پیغام دیا جاسکتا ہے۔۔۔ آپ فکر نہ کریں۔۔۔ یہ کام ہم کر لیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ تو پھر ضرور ایسا کریں۔“ انہوں نے کہا۔

ریسیور رکھ کر وہ دروازے کی طرف مڑیں۔۔۔ کیونکہ اسی وقت دروازہ کی کھنٹی بجائی گئی تھی۔۔۔ دروازے پر پہنچ کر وہ بولیں۔

”کون ہے دروازے پر؟“

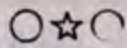
”انسپکٹر کامران مرزا کے نام ایک پیغام ہے۔“ باہر سے کہا گیا۔

”وہ گھر میں نہیں ہیں۔۔۔ پیغام اندر سرکا دیں۔“

”اس لفافے میں پیغام کے ساتھ دوسرے کاغذات بھی ہیں۔۔۔ دروازے کے نیچے سے نہیں سرک سکے گا۔“

”اچھا۔“ یہ کہہ کر انہوں نے دروازہ کھول دیا۔

”دوسرے ہی لمحے ان کے منہ سے کوئی چیز نکلرائی۔“



ہدایات دیں۔

”او کے سر۔۔۔ یہ کام ہم کر دیں گے۔“

”لیکن وہاں فوج اور پولیس کی نظریں گڑی ہیں۔۔۔ پہلے یہ سوچ

لو۔“

”او۔۔۔ وہ کیوں سر؟“ اس نے گھبرا کر کہا۔

”ہم انہی کی ہمت کے راستے آئے ہیں۔ لیکن تم صرف وہاں

موجود رہو۔ انہیں وہاں سے نکالنے کے لیے میں خود آؤں گا۔ بس

گاڑی تیار رکھنا ہے۔“

”کیا آپ گاڑی پر نہیں آئیں گے۔“

”گاڑی پر آؤں گا۔ میک اپ میں ہوں گا۔ احتیاط کا تقاضا یہ

ہے کہ دو گاڑیاں تیار ہوں۔“

”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا اور

پھر شار جستان کے دارالحکومت کے ایئرپورٹ پر فون کیا۔ پرواز کا نمبر

بتاتے ہوئے بولے۔

”کیا یہ پرواز ایئرپورٹ پر آچکی ہے۔“

”آئے ہی والی ہے۔“

”اس پر میرے ایک عزیز آرہے ہیں، کیا انہیں میرا ایک پیغام

دیا جا سکتا ہے۔ بہت اہم جنسی پیغام ہے۔“

”آپ کون بول رہے ہیں۔ اپنا نام اور ان کا نام نوٹ کروا

## اندر کے راستے

ایک ایسی جگہ۔۔۔ اور یہ بات چونکہ کوڈ میں ہو رہی تھی اس لیے کہ خطرہ نہیں تھا۔

”سر! ایک اطلاع فوری طور پر آپ کو دینا تھی۔۔۔ انسپکٹر کامرا مرزا اور ان کے بچے کسی مہم کے سلسلے میں شار جستان کے لیے روانہ ہو چکے ہیں اور وہاں کے ایئرپورٹ پر اترنے والے ہیں۔“

”ان کی پرواز کا نمبر تو معلوم کیا ہے نا۔“

”ہاں سر۔۔۔ کر چکا ہوں اور وہاں کے ایئرپورٹ سے بھی رابطہ

چکا ہوں۔۔۔ لیکن ابھی جہاز وہاں نہیں پہنچا۔“

”اچھی بات ہے۔۔۔ پرواز کا نمبر بتاؤ۔۔۔ میں ان سے خود بات

کروں گا۔“

”اسی لیے تو میں نے آپ کو فون کرنا ضروری خیال کیا۔“

”تم نے بہت اچھا کیا۔۔۔ تم اسی دوران ایک اور کام کر ڈالو۔“

یہ کہہ کر انہوں نے غلام رسول کے بیوی بچوں کے بارے میں



دیں۔“

”انسپکٹر جمشید ایک لمحے کے لیے چکرا کر رہ گئے۔ وہ نہ تو اپنا نام بتا سکتے تھے اور نہ ان کا لیکن پھر فوراً ہی ان کے دماغ میں بجلی کی کوندی وہ بولے۔

”بیگم کامی ہے ان کا نام اور میں انسپکٹر جامی بات کر رہا ہوں۔“  
”بہت بہتر سر آپ کا پیغام سیکر پر نشر کر دیا جائے گا جب سواریاں اتر کر اس طرف آئیں گی۔ اس وقت وہ یہ پیغام سن رہے۔“

”بہت خوب۔ شکریہ۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

”آپ کا بھی جواب نہیں۔“ فرزانہ بولی۔

”لیکن میں چکر کھا گیا تھا اس وقت۔“

”بہر حال خوب سوچھی۔“

”میں جا رہا ہوں۔ فون گھر کے نمبر پر آئے گا۔ اور اس وقت ہمارے گھر کی طرف کسی کی کوئی توجہ نہیں ہوگی۔ میں ایک اور پڑوسی کے گھر کے ذریعے اپنے گھر جاؤں گا۔ کیا سمجھے۔“

”اور فون سننے کے بعد وہاں سے غلام رسول صاحب کے ہاں آ سکتے ہیں۔ اسی پڑوسی کے راستے انہیں باہر لا سکتے ہیں۔“ فرزانہ نے جلدی جلدی کہا۔

”بالکل یہی کروں گا۔ تم بس دعا کرو۔“

”اللہ آپ کو حفاظت سے لے جائے اور بحفاظت لے آئے۔“  
ویسے کیا ہم بھی ساتھ نہ چلیں۔“

”اس طرح ہم پہچان لیے جائیں گے۔“ انہوں نے جلدی جلدی میک اپ کیا اور گھر سے نکل گئے۔ اس پڑوسی تک پہنچنے میں انہیں کوئی رکاوٹ نہ ہوئی۔ لیکن وہ انہیں دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا۔

”آپ کو خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب ہر وقت نہیں گزرے گا۔ کیونکہ یہ اندر کے راستے ہمیں معلوم ہیں۔ خدا رسول کا پتا بھی انہیں اس وجہ سے چل گیا کہ ان کے سامنے سوال یہ تھا کہ ہم نکل کیسے گئے۔“

”لیکن جب آپ غلام رسول کے بچوں کو نکال کر لے جائیں گے۔ اس وقت بھی ان کے سامنے یہ سوال آئے گا۔“ اس نے کہا۔  
”آئے گا۔ لیکن جب وہ حالات کا جائزہ لیں گے انہیں پتا چلے گا کہ میں اپنے گھر کے راستے انہیں نکال کر لے بھاگا ہوں۔ اور اگر باہر خطرہ ہو گا تو میں اس کا سامنا کر سکتا ہوں۔“

”خیر کوئی بات نہیں۔ آپ اپنا کام کر ڈالیں۔ میں آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔ اور اگر اس سلسلے میں کوئی پریشانی مجھ تک آئی تو آپ اس سے مبٹ ہی لیں گے۔ جیسے اس وقت غلام رسول کے بچوں کو نکالنے کے لیے آئے ہیں۔“

”ہاں بالکل۔ اور یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ یہ کام ہم

صرف اور صرف اپنے دین اور ملک کے لیے کر رہے ہیں۔“

”یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ جائیں۔ چھت کا راستا کھلا ہے۔“

وہ اس طرح پہلے اپنے گھر پہنچے۔ وہاں عین اس لمحے فون کی ٹھنٹی بجی۔ کچھ دیر تک بجتی رہی۔ پھر انہوں نے آواز نکالے بغیر ریسیور اٹھا لیا۔

”بیگم کامی بات کر رہی ہوں۔“

”جی میں جابی بول رہا ہوں۔“ انہوں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

”ہم نے آپ کا آرڈر تیار کر رکھا ہے۔ اب کیا کوئی نیا حکم ہے۔“

”ہاں! آپ فوری طور پر یہاں آکر ملاقات کریں۔“

”اچھی بات ہے۔ میں اپنے پاس سے بات کرتی ہوں۔“

”کتنی دیر بعد فون کریں گی۔ میں ذرا جلدی میں ہوں۔“

”پندرہ منٹ تک۔“

”اچھی بات ہے۔“ وہ بولے۔

اب انہیں وہاں پندرہ منٹ کے لیے رکتا پڑا۔ وہ چھت پر آئے اور سوراخوں سے مکان کے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ صرف دو کاشییل صدر دروازے کی طرف موجود تھے۔ وہ مسکرا دیئے۔ ان

سے پیچھا چھڑانا ان کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔

پندرہ منٹ بعد فون کی ٹھنٹی پھر بجی۔

”ہم آ رہے ہیں۔ انتظار فرمائیں۔“

”شکریہ بہت بہت۔“ وہ مسکرا کر بولے۔ پھر فون کا ریسیور رکھ

کر چھت کے راستے غلام رسول کے گھر میں داخل ہوئے۔ ان کے

بیوی بچے پہلے تو انہیں دیکھ کر ڈر گئے۔ لیکن ان کی آواز سن کر فوراً

خوش ہو گئے۔ انہوں نے جلدی جلدی صورت حال بتائی۔ گھر کے

دروازے اندر سے بند کیے اور انہیں چھت کے ذریعے اپنے گھر تک

لے آئے۔

چھت پر انہوں نے چند کپڑے ڈھیر کیے اور ان کو آگ لگا

دی۔ دھواں اٹھنے لگا۔ انہوں نے کاشییلوں کو چوتکتے دیکھا۔ وہ

مسکراتے ہوئے نیچے آ گئے۔ غلام رسول کے بیوی بچوں کو ساتھ لے

پائیں باغ والی کھڑکی تک آ گئے۔ کاشییلوں نے باہر کا تالا توڑا اور

انہوں نے اندر داخل ہو کر سیدھے چھت کی طرف دوڑ لگا دی۔ اسی

لمحے وہ باہر نکل گئے اور اپنی گاڑی میں جا بیٹھے۔ دوسرے ہی لمحے ان

کی گاڑی ہوا ہو گئی۔ حفاظت کے خیال سے ان کے کارکن نے اپنی

گاڑی کچھ فاصلے سے ان کے تعاقب میں لگا دی۔ اس طرح وہ اپنے

ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ غلام رسول، بیوی اور بچوں کو دیکھ کر خوش ہو

گیا۔



”اور شار جستان کا کیا رہا۔“

”طریقہ خوب رہا۔ بات ہو گئی ہے۔ وہ لوگ آ جائیں گے۔“

”اور ہم نے اب تک شوکی برادرز سے بات نہیں کی۔“ فاروق

نے کہا۔

”ہاں انہیں بھی بلا لینا چاہیے۔ ابھی تک کوئی سرکاری اعلان

نہیں کیا گیا۔ نہ جانے ان لوگوں کا پروگرام کیا ہے۔ حالات کس

کروٹ بیٹھنے والے ہیں۔ خیر۔ میں اپنے کارکنوں کو ہدایات دیتا

ہوں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے باہر موجود کارکن کو وائر لیس سیٹ پر

مخاطب کیا۔

”بھئی تم نے ایک پارٹی سے تو بات کر لی۔ اور دوسری پارٹی۔“

”اوہ سر۔ اس کے بارے میں تو آپ نے ہدایات نہیں دی

تھیں۔“

”اگر میں بھول گیا تھا۔ تو تم یاد تو کرا سکتے تھے۔“ وہ

مسکرائے۔

”غلطی ہو گئی سر۔ اس نے کانپ کر کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ اب ان سے رابطہ کر۔ سارا کاروبار

خوب ہو رہا ہے۔“

”اوہ سر۔“ وہ بولا۔

”تھوڑی دیر بعد اس نے پھر رابطہ کیا۔“

”سر! ان سے بات نہیں ہو رہی۔ گھر کے کسی فرد نے بتایا

ہے۔ کسی سلسلے میں کئی روز سے غائب ہیں۔“

”اوہ اچھا۔ پیغام ٹوٹ کر دنا تھا۔“

”کرا چکا ہوں سر۔ اب یہاں کے لیے کیا حکم ہے۔“

”تمام کارکنوں کو مختلف جگہوں پر رہنے کی ہدایت دے دو۔

لیکن اس طرح کہ جس وقت بھی انہیں اشارہ ملے، ایک جگہ نہ ہو

سکیں۔ بیرون ملک کارکنوں کو بھی خبردار کر دو۔ انہیں بھی آئی بھی

وقت جمع کر کے ہدایت مل سکتی ہے۔“

”اوہ سر۔“ کارکن بولا۔

سیٹ بند کر کے وہ ان کی طرف مڑے۔

”اب تم تینوں کے لیے ایک کام ہے۔ پہلے میک اپ کرا لو۔

پھر کام شروع کرنا۔“

انہوں نے ان کے چہروں پر میک اپ کیا۔ میک اپ کا جائزہ

لیا۔ اور غلام رسول اور ان کے بچے ان کی تبدیل شدہ شکلوں کو حیرت

بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”میرا خیال ہے۔ اب تم تینوں کو آسانی سے پہچانا نہیں جاسکے

گا۔“

”بالکل ایسا ہی ہے۔“

”تو پھر اپنے ذمے کام من لو۔ صدر صاحب کو کہاں رکھا گیا

ہے۔ بس تمہیں اتنا سراغ لگانا ہے۔ وہاں سے انہیں نکال کر لانا میرا کام ہو گا۔

”جی۔۔۔ سراغ لانا ہے۔ اور آپ یہ بات اس طرح کہہ رہے ہیں جیسے یہ کوئی مسئلہ ہی نہ ہو۔“

”اگر یہ کوئی مسئلہ نہ ہوتا تو پھر تم سے کہنے کی ضرورت نہیں تھی نہ میک اپ کرنے کی ضرورت تھی۔ میں جانتا ہوں۔۔۔ یہ ایک مشکل کام ہے۔ لیکن ذرا سوچو۔۔۔ صدر صاحب کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک ہو رہا ہو گا۔ اور ان کے گھر کے افراد کے ساتھ بھی۔۔۔ آخر ان کا قصور کیا ہے۔ صرف یہ کہ وہ اسلامی دنیا کے آدمی ہیں۔ اور ملک میں اسلام کا قانون نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اسلام دشمن طاقتیں ان کے صرف اسی وجہ سے خلاف ہیں۔ اور یہ سازش کی گئی ہے۔ اس کی بنیاد بھی نئی بات ہو گی۔ تم دیکھ لیتا۔ ملک کی باگ ڈور اب ضرور کسی بے دین کے ہاتھوں میں دی جائے گی۔“

”آخر ایسا کس طرح ممکن ہے؟“

”سازش بے ذریعے۔۔۔ پہلے ان کا اور میرا ریکارڈ جلا کر رکھ کر دیا۔ اس کام کے لیے جدید ترین آلات استعمال کیے گئے اور آدمی وہ چنا گیا۔ جو کسی کے ہاتھ نہیں آتا۔ یعنی رائوس۔ جب ریکارڈ رکھ کر دیا گیا۔ تو الزام عائد کر دیا گیا کہ صدر صاحب اور مجھ سے بہت سے سوالات پوچھے گئے تھے۔ ہم ان کے جواب نہیں دے سکے اور ہم نے

ریکارڈ جلا دیا۔ لہذا ہم غدار ہیں۔ صاف ظاہر ہے۔ اس سازش میں صرف بڑے لوگ شامل ہو سکتے ہیں اور ان بڑے لوگوں نے یہ کام انشارج یا بیگال کے اشارے پر کیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اب ملک کس کے حوالے کیا جاتا ہے۔“

”ہم نے ریڈیو نہیں لگا رکھا۔ خبریں کس طرح سنیں گے۔“

”اوہ ہاں۔۔۔ بھی خاور! ریڈیو تو لگا لو۔“ انہوں نے گھر کے مالک سے کہا۔ اس کا نام تو خاور تھا۔ لیکن کارکن ہونے کے لحاظ سے اس کا نمبر ستائیس تھا۔ خاور ریڈیو لگانے کے لیے اٹھ اسی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ باہر موجود ایک کارکن کا فون تھا۔ اس نے بتایا کہ ملک میں مارشل لاء لگا دیا گیا ہے۔ اور اب حکومت فوج کے ہاتھ میں آگئی ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال تھا۔ کہ ایسا ہو گا۔ وہ مایوسانہ انداز میں بولے۔“

”لیکن اباجان۔ ہماری فوج کے بڑے بڑے تو تمام آفیسر بہت محب وطن ہیں۔ انہوں نے سازشیوں کا ساتھ کس طرح دے ڈالا۔“

”انہیں ثبوت دکھائے گئے ہیں۔ کہ صدر صاحب نے آخر سارا ریکارڈ کیوں جلا دیا۔“

”اور ساتھ ہی آپ کا ریکارڈ کیوں جلایا گیا۔“

”صدر صاحب کا ریکارڈ جل جانے کی صورت میں میرے پاس



کچھ ایسی فائلیں تھیں۔ جن سے کام چلایا جاسکتا تھا۔

”اوہ! لیکن یہ بات انہیں کس طرح معلوم ہو گئی۔“ فرزانہ اچھل پڑی۔

”دوست۔ بہت خوب فرزانہ۔ بہت اچھا پوائنٹ ہے۔ ہم اب پہلے یہ کام کریں گے۔ ہمیں غور کرنا ہو گا۔ یہ بات انہیں کس طرح معلوم ہو گئی۔ انپکٹر جمشید نے کہا۔“

”یہ بات آپ آدیا صدر صاحب کو معلوم ہو سکتی ہے۔“ فرزانہ نے جلدی جلدی کہا۔

”ہاں! واقعی۔۔۔ یہ بہت غور طلب بات ہے۔ ہمارے لیے بہت اچھے سوچیں۔ غور کرو۔“

”لیکن ہم تو صدر صاحب کا سراغ لگانے کے لیے نکل رہے ہیں۔“ فاروق نے منہ بنایا۔

”ہوں ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ ایک ایک کر کے نکلتا۔ تاکہ باہر کوئی معاملہ پیش آجائے تو اس سے مٹ سکوں۔ یوں تو خفیہ کارکن باہر موجود ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں اور اس بات پر جلد از جلد غور کر لیں کے سازشیوں کو کس طرح پتا چل گیا کہ آپ کے فائلوں کی ذریعے بھی صدر صاحب کام چلا سکتے ہیں۔“

”ہاں! تم فکر نہ کرو۔ یہ میرا کام ہو گا۔ صدر صاحب کا

سراغ لگانا تمہارا کام ہو گا۔“

”اگرچہ ہمیں کچھ بھائی نہیں دے رہا کہ انہیں کس طرح تلاش کریں۔ کیا کریں۔ کیا نہ کریں۔“ محمود نے برا سامنہ بناتے ہوئے کہا۔

”یہ بات فرزانہ سے پوچھو۔ لیکن باہر جا کر۔ جس قدر جلد تم سراغ لگا لو گے۔ اتنی ہی زبردست تمہیں شاباش ملے گی۔“

”جی بہت بہتر۔“ وہ ایک ساتھ بولے اور باہر نکل گئے۔ دروازہ اندر سے بند کرتے ہوئے انپکٹر جمشید سوچ رہے تھے۔ کہ آخر انہیں کو یہ بات کس طرح معلوم ہو گئی۔ اچانک ان کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہو گئے۔ پھر وہ اچھل پڑے۔

”میں جا رہا ہوں۔ اس آدمی کا پتا چل گیا ہے۔ جس نے فائلوں کے بارے میں سازشیوں کو بتایا تھا۔“

ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ اٹھے۔ عین اس وقت کسی نے دروازے پر دستک دی۔ وہ سوالیہ انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر انپکٹر جمشید کے قدم دروازے کی طرف اٹھنے لگے۔ اور ان کے دل دھک دھک کرنے لگے۔

## دروازہ کھول دو

تینوں باہر نکل کر ایک جگہ جمع ہو گئے اور پیدل چلتے دور لڑے آئے۔۔۔ پھر ایک پارک میں آکر بیٹھ گئے۔  
”سوال یہ ہے کہ ہم صدر صاحب کا سراغ کس طرح لگائیں؟“  
محمود نے کہا۔

”شاید یہ اس کیس کا سب سے مشکل سوال ہے۔“ فاروق نے کہا۔  
”اور اس کو حل کرنا ہو گا۔“ فرزانہ مسکرائی۔  
”یہ کوئی حساب کا سوال نہیں ہے۔۔۔ جس کو حل کرنا ہو گا۔“  
فاروق نے اسے گھورا۔

”تب پھر ہم یہاں کیوں بیٹھے ہیں۔۔۔ آؤ واپس چلیں اور اہلکاروں سے کہہ دیں۔۔۔ یہ کام ہمارے بس کا نہیں۔“  
”افسوس! ہم ایسا نہیں کر سکتے۔“ محمود نے منہ بنایا۔

”نہیں کر سکتے تو پھر اتنا تو کر سکتے ہیں کہ صدر صاحب کا سراغ لگالیں۔“

”یہی تو مسئلہ ہے۔۔۔ کیسے لگالیں۔“

”اصل سے کام لے کر۔۔۔ ہمیں سوچنا ہو گا۔۔۔ انہیں کہاں رکھا جائے۔“

”اگر اصل تو تمہارے پاس ہے۔۔۔ مارو اس کو ہاتھ۔“ فاروق نے کہا۔

”فرزانہ سوچ میں ڈوب گئی۔۔۔ بہت دیر تک غور کرتی رہی۔۔۔

اس نے سر نہ اٹھایا اور دونوں تنگ آ گئے تو محمود بولا۔

”اپنی سوچ چلیں تم ترکیب۔“

”مارو۔۔۔ اس پر عمل شروع کرو۔“

”کیس؟“ دونوں فوراً بولے۔

”اس کریب پر۔۔۔ جو میں سوچ چکی ہوں۔“ اس نے جھٹائے اور اس میں کہا۔

”محمود نے اپنی ران پر ہاتھ مارا۔

”مارا۔“ ساتھ ہی فرزانہ چلائی۔

”محمود ہے۔۔۔ ادھر تو محمود نے ہاتھ مارا۔۔۔ اور فرزانہ کہہ رہی ہے۔۔۔ آخر یہ چکر کیا ہے۔“

”میرے ذہن میں ایک عدد ترکیب آ گئی ہے۔“

”اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔۔۔ ان حالات میں اس کی ترکیب سوجھ جائے۔“

”اس وقت باگ ڈور ہے کمانڈر انچیف کے ہاتھ میں۔۔۔ صدر



صاحب کے بارے میں انہیں ضرور ساتھ ساتھ بتایا جا رہا ہو گا۔ لہذا ہم ان سے پوچھ لیتے ہیں۔

”کیسے پوچھ لیتے ہیں۔۔۔ سوال تو یہ ہے۔ کیا تمہارا دماغ آج گھاس چرنے گیا ہوا ہے۔“

”نہیں۔۔۔ یہیں ہے۔ ابھی ابھی تو اس نے مجھے یہ ترکیب بتائی ہے۔“ فرزانہ نے منہ بتایا۔

”اس سے زیادہ بھونڈی ترکیب ہم نے آج تک نہ سنی ہوگی۔“ محمود نے فوراً کہا۔

”اور نہ آئندہ سنیں گے۔“ فاروق بولا۔

”لیکن تم نے ترکیب پر غور نہیں کیا۔“ فرزانہ نے مسکرا کر کہا۔

”اس میں کوئی غور کرنے والی بات ہو تو غور کریں گے نا۔“

یہاں تو دور دو تک کوئی بات نظر نہیں آ رہی۔ بلکہ غور کرنے والی بات اس طرح غائب ہے۔ جس طرح گدھے کے سر سے سینک۔

”تم غور کرو گے تو بات نظر آئے گی نا۔“ فرزانہ نے پھر کہا۔

دونوں نے حیران ہو کر فرزانہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے

پر بلا کی سنجیدگی تھی۔

”ہائیں۔۔۔ یہ تو حد درجے سنجیدہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ

اس کی بات پر واقعی غور کیا جاسکتا ہے۔“

”تو پھر چلو۔۔۔ کر لو غور۔۔۔ ہمارا کیا جاتا ہے۔“

”ہاں اور کیا۔“

دونوں نے غور شروع کیا۔۔۔ اور پھر اچھل پڑے۔۔۔ واقعی فرزانہ کی ترکیب پر عمل کیا جاسکتا تھا۔ کمانڈر انچیف کی بیٹی فرزانہ کی سہیلی۔۔۔ باتوں باتوں میں اس سے کوئی بات کی جاسکتی تھی۔

وہ ایک پبلک فون بوتھ تک آئے۔ فرزانہ نے کمانڈر انچیف کے گھر کے نمبر ملائے۔

”میں سونیا سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ اس کی سہیلی بات کر رہی ہوں۔“

”آپ کا نام۔“

فرزانہ نے ایک لمحہ کے لیے سوچا۔۔۔ پھر بولی۔

”میرا نام ہے فرزانہ ہے۔“

”جی اچھا۔۔۔ ایک منٹ انتظار فرمائیں۔“

ایک منٹ بعد سونیا کی آواز سنائی دی۔

”ہیلو فرزانہ۔۔۔ تم لوگ کہاں ہو۔۔۔ میں نے تو سنا ہے۔۔۔“

”پہلے میری بات سن لو۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”ہاں ضرور۔“

”میں ملنا چاہتی ہوں۔ کیا ہم پارک میں مل سکتے ہیں۔“

”ہاں ضرور کیوں نہیں۔۔۔ میں وہاں آ جاتی ہوں۔“



”شکریہ بہت بہت۔“ فرزانہ نے کہا اور فون بند کر دیا۔

”وہ پاک میں ملے گی۔۔۔ آؤ چلیں۔“

”کیا ہم یہ کام اس قدر آسانی سے کر سکیں گے۔“

”کمانڈر انچیف جالب ریاض سوچ بھی نہیں سکتے کہ یہ کام

میری بیٹی کے ذریعے بھی کر سکتے ہیں۔ لہذا انہوں نے بیٹی کو کچھ بتایا ہو گا۔“

”پھر بھی خطرہ ہے۔۔۔ کہیں ہم پکڑے نہ جائیں۔“

”دیکھا جائے گا۔۔۔ جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں کا کیا

محمود نے کہا۔

تینوں پارک میں پہنچ گئے۔۔۔ سونیا ان سے پہلے پہنچ گئی تھی

بے تابانہ انداز میں ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر

گئی اور بے چینی کے عالم میں ان کی طرف بڑھی۔

انہوں نے منہ سے آواز نکالی تو اس نے آواز کے ذریعے

لیا۔۔۔

(نوٹ= تینوں بہن بھائی تو میک اپ میں ہیں سونیا کیسے پہچان گئی؟)

”خطرہ ہے۔۔۔ تم لوگ گرفتار کر لیے جاؤ۔۔۔ میں پہلے ہی

دبئی ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ ایک ساتھ بولے۔۔۔ چہروں کے رنگ

گئے۔۔۔ ان حالات میں ان کی گرفتاری ان کے والد کی پریشانیوں

اضافہ کر سکتی تھی۔

”جب میں گھر سے نکلنے لگی تو عمران نے ان گنت سوالات

کیے۔۔۔ جب کہ پہلے ایسا نہیں ہوا تھا۔۔۔ اس نے مجھے خبردار بھی کیا کہ

میرا گھر سے باہر نکلنا ٹھیک نہیں۔۔۔ ملک کے حالات بہت خوفناک

ہیں۔۔۔ کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے۔۔۔ اس پر میں نے ان سے کہا کہ

مجھ پر باہر نکلنے کے سلسلے میں کوئی پابندی نہیں ہے۔۔۔ اور اگر ایسا ہوتا تو

پاپا ضرور مجھے بتا دیتے۔ لہذا وہ میرا راستہ نہ روکے۔۔۔ اس طرح اس

نے مجھے آنے دیا۔۔۔ لیکن میں جانتی ہوں۔۔۔ اسے شک ہو چکا ہے۔“

”اچھا۔۔۔ اللہ مالک ہے۔۔۔ ہم لوگ تو بس یہ جاننا چاہتے ہیں کہ

صدر صاحب کو کہاں رکھا گیا ہے۔۔۔ آپ جانتی ہی ہیں۔۔۔ ہمارے صدر

صاحب ملک کے سچے ہمدرد ہیں۔“

”ہاں! مجھے پاپا کا یہ اقدام بالکل پسند نہیں آیا۔۔۔ پاپا کو حکومت پر

قبضہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”انہوں نے بھی اپنی خواہش سے ایسا نہیں کیا۔۔۔ وہ بھی مجبور

ہیں۔“ فرزانہ نے کچھ سوچ کر کہا۔

”کیا مطلب؟“

”ہمارے ملک کے خلاف ایک زبردست سازش کی گئی ہے۔۔۔

اس قدر زبردست کہ اس کی لپیٹ میں آپ کے پاپا بھی آ گئے ہیں۔۔۔

جہاں تک ہم سمجھتے ہیں ان کا شاید کوئی قصور نہیں۔۔۔ لیکن وہ کیوں ایسا



کرنے پر مجبور ہوئے۔ یہ ہمیں سراغ لگانا ہے۔ اور ہم اس بات کا سراغ اس وقت تک نہیں لگا سکتے جب تک کہ صدر صاحب کا سراغ نہ لگالیں۔ اور صدر صاحب کو کسی نامعلوم مقام پر رکھا ہوا ہے۔

”اچھا تو پھر؟“ اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

”پھر یہ کہ ہم جاننا چاہتے ہیں۔ صدر صاحب کو کہاں رکھا گیا

ہے۔

”یہ بات تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ میں بھلا اس سلسلے میں کیا مدد کر سکتی ہوں۔“ اس نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

”آپ مدد کر سکتی ہیں۔ اپنے پیپا کے آس پاس رہیے۔ یا پھر چھپ کر باتیں سنئے۔ کوئی پیغام فون پر آئے۔ وائزلس پر آئے۔

اس کو ٹیپ کرنے کی کوشش کریں۔ اور سننے کی بھی کوشش کریں۔ ہم آپ سے فون کر کے رپورٹ لیتے رہیں گے۔ اس طرح آج نہیں

توکل ہم سراغ لگالیں کہ صدر صاحب کو کہاں رکھا گیا ہے۔ پھر ہم انہیں وہاں سے نکال لائیں گے۔“

”کیا واقعی۔۔۔ لیکن اس طرح تو میرے پیپا مشکل میں پھنس جائیں گے۔ اگر صدر صاحب آگئے تو وہ ملک کے پھر سے صدر بن

جائیں گے اور پیپا کو گرفتار کر لیا جائے گا۔“

”میں نے کہا تھا۔ آپ کے پیپا بھی سازشیوں کے جال میں ہیں۔ انہیں جب تک اس جال سے نکالا نہیں جاتا اس وقت تک وہ

بھی مصیبت میں مبتلا رہیں گے۔“

”اچھی بات ہے۔ میں یہ کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن دیکھ لیں میرے پیپا کسی مشکل میں نہ گرفتار ہو جائیں۔“

”نہیں۔۔۔ ایسی بات نہیں ہوگی۔“

”اوکے۔۔۔ آپ فکر نہ کریں۔ بہت جلد میری طرف سے آپ لوگوں کو اطلاع ملے گی۔ اپنا فون نمبر تو مجھے دے دیں۔“

”ہم خود فون کر لیں گے۔ کیونکہ اس وقت ہمارا کوئی مستقل فون نمبر نہیں ہے۔“

”اچھی بات ہے۔“

”اور اس ملاقات کا پتا آپ کے پیپا کو ہرگز نہ چلے۔“

”اچھی بات ہے۔“

وہ وہاں سے چلے آئے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ اسی روز رات کو انہوں نے کمانڈر انچیف کے گھر کے نمبر ملائے۔ ملازم سے فرزانہ نے کہا۔

”سونیا سے بات کر ادیں۔ میں ان کی سہیلی بات کر رہی ہوں۔“

جلد ہی سونیا کی آواز سنائی دی۔

”ہاں سونیا۔۔۔ سکول کے کام کا کیا رہا۔“ فرزانہ نے فوراً کہا۔ رخصت ہوتے وقت یہ انہوں نے کوڈ مقرر کیا تھا۔

”خدا کا شکر ہے۔۔۔ سب کام ہو گیا۔۔۔ ارے ہاں ہرٹائی جانے کا  
لیا رہا۔“ سونیا بولی۔

فرزانہ چونک اٹھی۔۔۔ ہرٹائی کا نام اس کے کانوں میں گونجنے  
لگا۔۔۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے جلدی سے کہا۔

”افسوس! ابھی تک ہمارا کوئی پروگرام نہیں بن سکا۔“

”خیر کوئی بات نہیں۔۔۔ اور کوئی بات؟“

”نہیں بس۔۔۔ اور کوئی کوئی خاص بات نہیں۔۔۔ خدا حافظ۔“

ریسیور رکھ کر فرزانہ ان کی طرف مڑی۔

”صدر صاحب کو ہرٹائی لے جایا گیا ہے۔“

”اف مالک۔۔۔ وہ پھاڑوں کے درمیان بنائی گئی جیل۔۔۔ جس میں

تہ خانے کے نیچے تہ خانے ہیں۔“

”ہاں۔۔۔ وہیں۔۔۔ سنا ہے آج تک وہاں سے کوئی شخص فرار

نہیں ہو سکا۔۔۔ اور نہ کن قیدین کو رہا کر دیا گیا۔“

”اللہ اپنا رحم فرمائے۔۔۔ اب ہمیں اباجان بی واپسی کا انتظار کرنا

ہو گا۔۔۔ ان کے ساتھ ہی ہم ہرٹائی کا پروگرام ترتیب دے سکتے ہیں۔“

عین اس وقت دروازے پر دستک ہوئی۔۔۔ لیکن انداز انپکڑ

جیشید کا سا نہیں تھا۔

”یہ کون ہو سکتا ہے؟“ فرزانہ نے دھک دھک کرتے دل کے

ساتھ کہا۔

”اللہ جانے۔۔۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔۔۔ اباجان کو یہ جگہ چھوڑ  
کر کہیں نہیں جانا چاہیے تھے۔۔۔ وہ بس کارکنوں سے کام لیتے رہتے۔“

”اب دروازہ کھولنا ہو گا۔“ محمود نے کہا۔

”آپ لوگ دائیں طرف والے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ  
جائیں۔۔۔ ہم دیکھتے ہیں۔۔۔ وہ کون ہے۔“

”خان رحمان اور پروفیسر داؤد سمیت سب لوگوں کو کمرے میں  
بند کر کے وہ دروازے پر آئے۔

”کون صاحب ہیں؟“ محمود نے پرسکون انداز میں کہا۔

”دروازہ کھول دو۔۔۔ ورنہ توڑ دیا جائے گا۔“ باہر سے بارعب

آواز میں کہا گیا۔

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”حیرت ہے۔۔۔ خفیہ کارکن کہاں چلا گیا؟“ محمود بولا۔

”اگر باہر ہے بھی تو بھی کیا کر سکتا ہے۔۔۔ ہو سکتا ہے۔۔۔ باہر

فوج ہو۔۔۔ اب وہ فوج سے تو ٹکڑ نہیں لے سکتا نا۔“ فرزانہ نے کہا اور

اسے دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔۔۔ محمود نے اللہ کا نام لے کر دروازہ

کھول دیا۔



”جی ہاں۔۔۔ آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“ اس نے حیران ہو کر کہا۔

”میں انپکٹر جمشید ہوں۔“

”ارے۔۔۔ کیا آپ میک آپ میں ہیں۔“

”ہاں! میک آپ کے بغیر میں یہاں آ بھی کیسے سکتا تھا۔۔۔ یہ آپ کو معلوم نہیں۔۔۔ اس وقت ملک میں مارشل لاء لگایا جا چکا ہے۔۔۔ صدر صاحب پر اور مجھ پر ایک سنگین الزام لگایا گیا ہے۔۔۔ یہ کہ ہم نے بدعنوانیاں کی ہیں۔۔۔ اور جب بدعنوانیوں کے الزامات ہم پر لگائے گئے تو ہم نے تمام ریکارڈ راکھ کر دیا۔“

”ہاں! میں یہ الزامات پڑھ چکا ہوں۔۔۔ اور مارشل لاء کی خبر بھی میں نے پڑھی ہے۔“ اس نے کہا۔

”دیکھئے کاشان صاحب۔۔۔ اگر بات صرف صدر صاحب کی ہوتی۔۔۔ یہ کہ انہوں نے اپنا ریکارڈ جلا دیا ہے تو ہم معاملے کو اور طرح لیتے۔۔۔ لیکن اس معاملے کی عجیب ترین بات یہ ہے کہ ساتھ میں میں نے بھی اپنا ریکارڈ کیوں جلا دیا۔۔۔ مجھے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔ یا پھر صدر صاحب کے بعد بھی صرف میں نے ہی کیوں اپنا ریکارڈ جلا دیا۔۔۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میرے پاس بھی کچھ ایسی فائلیں تھیں جن کے ذریعے بدعنوانیاں ثابت کی جاسکتی تھیں۔۔۔ اوہو! آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔۔۔ میں نے یا صدر صاحب نے کوئی بے ایمانی نہیں کی

## ایک منٹ

انپکٹر جمشید نے ایک دروازے پر دستک دی۔۔۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی نے دروازہ کھولا اور سوالیہ انداز میں ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”فرمائیے۔۔۔ کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”آپ کاشان خان ہیں۔“ انہوں نے کہا۔

”ہاں بالکل۔۔۔ لیکن میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔“

”بیٹھ کہہ نہات۔ کر سکتا ہوں۔۔۔ دروازے پر کھڑے ہو کر بات کرنے کی مجھے عادت نہیں۔“ انہوں نے منہ بنایا۔

”اوہ اچھا۔۔۔ آئیے۔“

وہ انہیں اندر لے آیا۔۔۔ ڈرائنگ روم شان دار طریقے پر سجا ہوا تھا۔۔۔ بے تحاشہ دولت صرف کی گئی تھی۔

”یہ ڈرائنگ روم اس حد تک کیوں سجا ہوا ہے۔۔۔ آپ تو صرف ایک سرکاری فوٹو گرافر ہیں۔۔۔ سرکاری کاغذات کی فوٹو کاپیاں بنانے والے۔۔۔ اور فوٹو شیٹ کرنے والے۔“

تھی۔۔۔ اصل میں تو ریکارڈ جلا کر یہ الزام لگایا گیا ہے۔۔۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ریکارڈ جلانے والے کو یہ بات کس طرح معلوم ہو گئی تھی کہ صدر صاحب سے متعلق کچھ فائلیں میرے پاس بھی ہیں۔۔۔ اور جب تک ان کو بھی نہ جلا دیا جائے گا۔۔۔ بات نہیں بنے گی۔۔۔ الزام حمل نہیں ہو گا۔۔۔ کیونکہ اگر صرف ایک کا ریکارڈ جلایا جاتا تو میں اپنے ریکارڈ کے ذریعے ان کو بے گناہ ثابت کر سکتا تھا۔۔۔ لہذا ادھر ان کا ریکارڈ جلایا گیا۔۔۔ ادھر میرا۔۔۔

”جی ہاں! یہی بات ہے۔۔۔ لیکن آپ میرے پاس کیوں آئے ہیں؟“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”میرا آپ سے سوال ہے۔۔۔ فائلیں جلانے والے کو یہ بات کیسے معلوم ہو گئی تھی کہ کچھ ایسی فائلیں میرے پاس بھی ہیں۔۔۔ جن سے بے گناہی ثابت ہو سکتی ہے۔۔۔ جب کہ یہ بات صرف میرے اور صدر صاحب کے درمیان تھی۔“

”کیا مطلب؟“ وہ بہت زور سے اچھلا۔

”ان فائلوں کے بارے میں یا تو صدر صاحب کو معلوم تھا۔۔۔ یا مجھے۔۔۔ ہم دونوں تو فائلیں جلانے والے کو یہ بات بتا نہیں سکتے تھے۔۔۔ لہذا یہ بات ہم دونوں کے علاوہ اگر کسی کو معلوم تھی تو آپ کو۔۔۔ کیونکہ فائلوں کی کاپیاں آپ کے ذریعے تیار کروائی گئی تھیں۔۔۔ آپ کو یاد ہو گا۔۔۔ وہ فائلیں خود میں نے آپ کو اپنے ہاتھ سے دی تھیں اور

کہنا تھا کہ یہ خفیہ قسم کی ہیں۔۔۔ اور ان کے بارے میں کوئی بات باہر نہ نکلے۔“

”ہاں! آپ نے یہ بات مجھ سے کہی تھی۔“ اس نے کھوئے انداز میں کہا۔

”تو پھر۔۔۔ یہ راز باہر کیسے پہنچ گیا۔“

”نہیں نہیں جانتا۔“ وہ بولا۔

”کیا بات کرتے ہیں۔۔۔ آپ نہیں جانتے۔۔۔ آپ کے علاوہ اور کون جاسکتا ہے اس بات کو۔“

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“

”یہ کہ آپ نے اس راز کو فروخت کر دیا ہے۔۔۔ فائلیں جلانے والے نے صدر صاحب کا ریکارڈ جلانے سے پہلے آپ سے ملاقات کی تھی اور یہ پوچھا تھا کہ صدر صاحب کی فائلوں کا ریکارڈ کیسے اور تو نہیں ہوتا۔۔۔ اس کی نقل کسی اور جگہ محفوظ تو نہیں کی گئی۔۔۔ لہذا آپ نے لالچ میں آکر۔۔۔ ایک بڑی رقم اس سے لے کر اسے یہ بتا دیا کہ میرے پاس ہیں۔“

”نہیں۔۔۔ یہ مجھ پر سراسر الزام ہے۔“

انہوں نے فوراً جیب سے پستول نکال لیا۔

”خبردار۔۔۔ کوئی حرکت نہ کرنا۔۔۔ ہاتھ اوپر اٹھا دو۔“

”کیا مطلب۔۔۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔“



”غداروں کے ساتھ میں ایسا ہی کیا کرتا ہوں۔۔۔ تم اس ملک کے غدار ہو۔۔۔ اور تمہاری غداری کی وجہ سے آج ملک کے صدر کو نامعلوم جگہ پر لے جایا گیا ہے۔۔۔ وہاں ان کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک ہو رہا ہو گا۔۔۔ جب کہ وہ بالکل بے گناہ ہیں۔۔۔ انہوں نے ایک فیصد بھی بے ایمانی نہیں کی۔۔۔ ہاں پچھلے صدر نے خوب بے ایمانیاں کی تھیں۔۔۔ ان کا انجام سب کو معلوم ہی ہے۔۔۔ لیکن ان کے ساتھ کیا ہوا۔۔۔ یہ تو اسانی نہ تھی۔۔۔ کہ تھے۔۔۔ ملک میں اسلام نافذ کرنے کے لیے بری طرح بے تاب تھے کہ ایسے میں بدعنوانی کے الزامات لگا دیئے گئے۔۔۔ ہے کوئی تک۔۔۔ مطلب تھا۔۔۔ انہیں راستے سے ہٹانا۔۔۔ اب فوج اعلان کرے گی کہ تین ماہ میں ملک میں نئے انتخابات کرا دیئے گی۔۔۔ لیکن اس طرح جو ملک کا صدر بنے گا۔۔۔ وہ اسلام دشمن طاقتوں کا چننا ہوا ہو گا۔۔۔ اور ملک ایک بار پھر بڑی طاقتوں کی گود میں چلا جائے گا۔۔۔ کبھی کبھی ایک آدمی کی غداری سے بھی ایسا ہو جاتا ہے۔۔۔ اب تم بتاؤ۔۔۔ کتنی رقم لی تھی تم نے؟“ انہوں نے نفرت زدہ انداز میں کہا۔

”نہیں۔۔۔ میں نے رشوت نہیں لی۔“ وہ کانپ گیا۔

”میں صرف تین تک گنتوں گا۔۔۔ تم نے بچ اگل دیا تو کوئی نہیں چلاؤں گا۔۔۔ اور اگر بچ نہ اگلا تو پھر میں تمہیں گولی ضرور ماروں گا“ اگرچہ یہ میرا طریقہ نہیں۔۔۔ لیکن ان حالات میں جب کہ نہ میں پولیس سے کام لے سکتا ہوں نہ کسی اور محکمہ سے۔۔۔ مجھے قانون کو اپنے ہاتھ

میں لیتا ہی پڑے گا۔۔۔ لہذا ایک۔“

”نہیں۔“ اس کا رنگ ازگرا۔

”دو۔۔۔ تین کہنے کے بعد جنہیں مہلت نہیں ملے گی۔“

”ٹھہریئے۔۔۔ بتانا ہوں۔۔۔ میں نے ایک کروڑ روپے کی رشوت لی ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔۔۔ تم نے جان کے خوف سے جھوٹ بولا ہو۔۔۔ اس بات کا ثبوت کیا ہے؟“

”کمان بک میں رقم موجود ہے۔۔۔ لیکن وہ کسی کو بتاتے نہیں۔۔۔ صرف فاؤنٹ والے کو بتاتے ہیں۔“

”فون کرو انہیں۔۔۔ جب وہ بیلنس بتانے لگے، اس وقت ریپور مجھے دے دینا۔“

”آپ میری بات پر یقین کیوں نہیں کر لیتے؟“ اس نے جل کر کہا۔

”نہیں کروں گا۔۔۔ فون کرو۔“ وہ غرائے۔

”آجائیں مسٹر رائور۔۔۔ یہ صاحب اس طرح نہیں مانیں گے۔“

آپ کا خیال ٹھیک تھا۔۔۔ کاشان خان نے بلند آواز میں کہا۔

”کیا کہا۔۔۔ مسٹر رائور۔“ انسپکٹر جمشید بری طرح چونکے۔

عین اس وقت ساتھ اندرونی دروازہ کھلا اور رائور مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔



”اوہ! تو آپ یہاں بھی موجود ہیں۔“

”میں جانتا تھا۔ آپ کسی اور جگہ جائیں یا نہ جائیں۔۔۔ یہاں ضرور آئیں گے۔“

”اندازے کی تعریف کرنا پڑے گی۔ مسٹر کاشان خان کو کتنی رشوت دی گئی۔“

”پانچ کروڑ۔ چار کروڑ کا جھوٹ بول رہے تھے یہ۔۔۔ لیکن مذاق میں۔۔۔ میں نے انہیں پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ انہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔۔۔ راٹور ان لوگوں کا موت کی حد تک ساتھ دیتا ہے۔۔۔ جو اس کے لیے کام کرتے ہیں۔“

”بہت خوب! مان گئے بھی۔۔۔ اب تم ذرا اس سازش کے بارے میں بتا دو۔“

”نہیں۔۔۔ بس میں آپ کو یہ بات نہیں بتا سکتا۔“ اس نے پرزور انداز میں انکار کیا۔

”ویسے تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔۔۔ صدر صاحب اسلامی ذہن کے ہیں۔۔۔ اگر انہیں صدارت سے نہ ہٹایا جائے گا۔۔۔ تو ملک اسلامی ہوتا چلا جائے گا۔۔۔ اور اسلام دشمن طاقتیں بس ایک یہی بات پسند نہیں کرتیں۔“

”جو جی میں آئے سوچیں۔۔۔ اب آپ سامنے دو راستے ہیں۔۔۔ یہاں سے نکل جائیں۔۔۔ اور مسٹر کاشان خان کو بھول جائیں۔۔۔ اگر

میں جان سے مارنے کی کوشش کریں گے تو میں آپ کے راستے میں آؤں گا۔۔۔ مجھ سے مقابلہ کرنا آپ کے بس کا روگ نہیں ہے۔۔۔ اور آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ آپ مجھ سے مقابلہ کر سکتے ہیں تو پھر آجائیں۔“

”ضرور۔۔۔ کیوں نہیں۔“ انسپکٹر جمشید بھرپور انداز میں مسکراتے ہوئے بولے۔

”کیا مطلب۔۔۔ آپ کا جواب سمجھ میں نہیں آیا۔۔۔ آپ جانا نہیں گے یا ستائے۔“

”میرا بھی ایک اصول ہے۔۔۔ اور وہ یہ کہ غدار کو ہرگز نہ چھوڑا جائے۔۔۔ اس نے آپ کو مدد کے لیے بلا کر یا آپ نے اس کی مدد کے لیے آکر غلطی کی۔۔۔ اب اسے ہرگز نہیں چھوڑا جائے گا۔۔۔ پہلے میں اس کی بنیاد پر شاید اسے جان سے نہ مارتا۔۔۔ لیکن اب تو اس کے جرم کا ثبوت مل گیا ہے۔۔۔ لہذا یہ میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکے گا۔“

ان الفاظ کے ساتھ ہی انہوں نے فائر کر دیا۔۔۔ ادھر انہوں نے مار کیا۔۔۔ ادھر راٹور بجلی کے کوندے کی طرح گولی کے اور کاشان خان کے درمیان آ گیا۔۔۔ لہذا گولی راٹور کے جسم سے ٹکرائی اور ٹکرا کر وہیں اسی زاویے سے انسپکٹر جمشید کی طرف گئی۔۔۔ اگر وہ گرنے پڑتے تو گولی ان کے جسم میں داخل ہو گئی تھی۔

”بہت خوب! آپ کو بھی دانا پڑے گا۔“ راٹور نے ہنس کر کہا۔



انسپکٹر جمشید نے دوسرا فائر کیا۔ رائور نے پھر چھلانگ لگائی اور گولی اس کے جسم سے ٹکرائی۔ ادھر انسپکٹر جمشید بھی گرے۔

”مان گیا۔ مان گیا۔“ رائور نے بے تحاشہ تالی بجا دی۔

اسی وقت انہوں نے تیسرا فائر کر دیا۔ رائور اس وقت تالی بجانے میں مصروف تھا۔ لہذا فوری طور پر چھلانگ نہ لگا سکا اور گولی کاشان خان کے دل میں اتر گئی۔ وہ گرا اور ساکت ہو گیا۔ رائور پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔

”اوہ۔۔۔ یہ برا ہوا۔۔۔ اب انسپکٹر جمشید۔۔۔ میں آپ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”آؤ۔۔۔ آج تم سے بھی فیصلہ ہو جائے۔“

”میں چاہوں تو اسی وقت آپ کو فوج کے حوالے کر دوں۔۔۔ لیکن اس طرح مجھے مزا نہیں آئے گا۔ میں اپنے ہاتھوں سے آپ کا گلا گھونٹوں گا۔ جب آپ کی آنکھیں باہر نکل آئیں گی تا۔۔۔ اس وقت مجھے مزا آئے گا۔“ یہ کہہ کر وہ ان کی طرف بڑھنے لگا۔ اب انسپکٹر جمشید اس پر فائر نہیں کر سکتے تھے۔ فائر کرنے کا فائدہ بھی تو کوئی نہیں تھا، گولی تو اچٹ کر انہیں ہی لگتی۔ لہذا انہوں نے پستول جیب میں رکھ لیا۔

”آؤ مسٹر رائور، آج میں تمہیں حملہ کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔“ انہوں نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔

”نقصان میں رہیں گے۔“ وہ ہنس۔

”کوئی پروا نہیں۔“ وہ بولے۔

”اچھا تو پھر میں وار کر رہا ہوں۔۔۔ روک سکتے ہیں تو روک لیں اور بچا سکتے ہیں تو بچا لیں۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے ان کی طرف چھلانگ لگا دی۔

ٹھیک اسی وقت انہوں نے اپنی جگہ سے سرک کر چھلانگ لگائی۔ ان کا خیال تھا۔۔۔ اس طرح رائور دیوار سے ٹکرائے گا۔ لیکن ان کا اندازہ بالکل غلط ثابت ہو گیا۔ فضا میں ہی رائور نے ان کی بات بوت کرتے ہوئے اپنا رخ تبدیل کیا اور ان سے ٹکرا گیا۔ اس یوں محسوس ہوا جیسے ان پر کوئی مہبہ نہ پڑا ہو۔۔۔ دوسرے ہی لمحے وہ ساکت ہو گئے۔ تاہم ان کے حواس بحال تھے۔ وہ دیکھ بھی سکتے تھے اور سوچ بھی سکتے تھے۔ انہوں نے دیکھا۔ رائور نے فون کا ریسیور اٹھایا۔۔۔ نمبر ڈائل کیے اور بولا۔

”ہاں! کاشان خان کو انسپکٹر جمشید نے قتل کر دیا ہے۔۔۔ میں نے ان پر قابو پا لیا ہے۔۔۔ آکر انہیں گرفتار کر لیا جائے۔۔۔ ان پر فوجی حالت میں مقدمہ چلے گا۔۔۔ وہ بھی فوری نوعیت کی۔۔۔ میں اس قتل کا شہید دید گواہ ہوں۔۔۔ انسپکٹر جمشید کے پستول پر ان کی انگلیوں کے انکسار موجود ہیں۔۔۔ اور ان کے پستول سے چلائی گئی گولی کاشان خان کے جسم میں طے کی۔ لہذا اس سے مکمل ثبوت اور کیا ہو گا۔“



یہ کہ کر رائور نے ریسیور رکھ دیا۔۔۔ انسپکٹر جمشید نے حرکت کرنے کی کوشش کی۔۔۔ لیکن کمرے میں مٹری داخل ہوئی۔۔۔ انہوں انسپکٹر جمشید کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں لگا دیں۔  
 ”انہیں لے جائیں۔۔۔ اور وہاں پہنچا دیں۔۔۔ جہاں صدر صاحب کو رکھا ہوا ہے۔“  
 ”او کے سر۔“ وہ بولے۔

”اور یہ دونوں فرار نہ ہونے پائیں۔۔۔ جب تک یہ ہمارے میں ہیں۔۔۔ ہم اس ملک پر حکومت کرتے رہیں گے۔“

”تو پھر انہیں ختم ہی کون۔ کر دیا جائے۔“ ایک آفیسر نے کہا۔  
 ”ہاں! ایسا ہی کرنا ہو گا۔۔۔ بین زرا مزہ دار انداز میں۔“

باقاعدہ ایک تقریب منا کر کیا جائے گا۔۔۔ اس تقریب میں ان کی موت منظر پورے ملک کے لوگ دیکھیں گے۔۔۔ مطلب یہ کہ ٹی وی ذریعے۔۔۔ یہ منظر سب دیکھ سکیں گے۔۔۔ ان پر بھوکے شیر چھوڑ جائیں گے۔۔۔ لیکن پہلے ان کے باقی ساتھیوں کو گرفتار کرنا ہے۔۔۔

بھی اپنے جال میں آنے ہی والے ہیں۔۔۔ ہمارے پروگرام کے مطابق۔۔۔ انسپکٹر کامران مرزا کو ہم لوگ اطلاع دے چکے ہیں۔۔۔ شہر برادری بھی جو نئی اپنے گھر آئیں گے۔۔۔ انہیں یہاں آنے کی ہدایت جائے گی۔۔۔ وہ نہ بھی آئیں۔۔۔ تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔۔۔ وہ ہیں کمزور۔۔۔ ہمارے مقابلے میں انسپکٹر جمشید جیسے پانی بھرتے نظر آتے

ہیں۔“

”بس سر۔۔۔ آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔“ ایک فوجی آفیسر نے کہا۔

اور پھر وہ انہیں باہر لے آئے۔۔۔ گاڑی میں بٹھایا اور گاڑی روانہ ہو گئی۔۔۔ ان کا سفر ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہا۔۔۔ پھر پہاڑیوں میں گھری ایک عمارت میں گاڑی داخل ہوئی۔۔۔ انہیں گاڑی سے اتارا گیا۔

”انہیں بھی صدر صاحب کے پاس پہنچا دیا جائے۔“ مٹری آفیسر نے گرج دار آواز میں کہا۔

”ایک منٹ۔۔۔ کیا آپ میرے ملک کے ہی فوجی ہیں۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”آپ کے خیال میں میں کون ہوں۔“  
 ”اگر آپ میرے ملک کے فوجی ہوتے تو مجھ سے یہ سلوک نہ کرتے۔“

”آپ کی خوش فہمی ہے۔“  
 ”کیا مطلب؟“ وہ چونکے۔

”میں آپ کے ملک کی فوج کا ہی ایک آفیسر ہوں۔۔۔ اور آپ کا بدترین دشمن۔۔۔ اس جیل خانے میں جتنے فوجی ہیں۔۔۔ وہ سب آپ کے بدترین دشمن ہیں۔۔۔ اس لیے کہ آپ بھول رہے ہیں۔۔۔ فوج میں



صرف مسلمان ہی نہیں ہیں۔ آپ کے ملک کی حکومت نے فوج میں مرزائیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کو بھی تو ملازمتیں دے رکھی ہیں۔ اور مرزائی تو اونچے عہدوں پر بھی لگے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ ہم آپ ملک کے فوجی ہونے کے ناطے آپ کو یہاں سے فرار ہونے کی اجازت دے دیں گے۔ یہ بھول ہے آپ کی۔

”بھول تو ایک عدد مسٹر رائٹر سے بھی ہو گئی ہے۔“ انسپٹر جمشید بھرپور انداز میں مسکرائے۔

”کیا مطلب۔۔۔ کون سی بھول۔“

”جب تم رائٹر کو یہ بات بتاؤ گے تو وہ فوراً سمجھ جائے گا اس سے کیا بھول ہو چکی ہے۔ لیکن اس وقت، وقت گزر چکا ہو گا۔“

”آپ۔۔۔ آپ کتنا کیا چاہتے ہیں؟“

”رائٹر سے پوچھو جا کر۔“ وہ بولے۔

آفیسر کی آنکھوں میں الجھن نمودار ہو گئی۔ وہ چند لمحے تک انہیں گھورتا رہا پھر بولا۔

”آپ ہی بتا دیں، ان سے کیا غلطی ہوئی ہے۔“

”یوں مزا نہیں آئے گا۔“ انسپٹر جمشید مسکرائے۔

”کیا مطلب۔۔۔ پھر کیسے مزا آئے گا؟“

”وہ ہماری لاشوں کا تماشا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک تماشا ہم بھی

انہیں دکھائیں گے۔۔۔ تم جاؤ اور رائٹر کو بتاؤ۔۔۔ میں نے کیا کہا ہے۔۔۔ وہ فوراً ادھر آئے گا۔“

”تو تم نہیں بتاؤ گے۔“ وہ بولا۔

”نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔“ وہ بولے۔

”لیکن میں زبردستی اگوا سکتا ہوں۔“ اس نے جھلا کر کہا۔

”یہ کوشش بھی کر کے دیکھ لو۔“ وہ ہنسے۔

آفیسر ان کی ہنسی سن کر ہل گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ پھر اس نے مرحمائے ہوئے انداز میں کہا۔

”نہیں! میں زبردستی نہیں اگواؤں گا۔۔۔ مسٹر رائٹر کو فون پر اطلاع دوں گا کہ آپ کیا کر رہے تھے۔“

”جو جی میں آئے کرو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ انسپٹر جمشید نے یہ اسامہ بنا کر کہا۔

انہیں جیل کی ایک تنگ و تاریک نوخیزی میں بند کر دیا گیا۔ لیکن ایک گھنٹا بھی نہیں گزرا تھا کہ انہیں باہر نکالا گیا۔ جلد ہی وہ ایک کمرے میں رائٹر کے سامنے بیٹھے تھے۔

”ہاں! اب کہیں کیا کہتے ہیں۔۔۔ مجھ سے کیا غلطی ہوئی ہے۔“

”یہ آپ خود سوچئے۔۔۔ مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں؟“

”سوچ چکا ہوں۔ یہاں آنے سے پہلے سوچنا شروع کیا تھا۔۔۔“

اب تک سوچتا رہا ہوں۔ لیکن کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔“

”لیکن مسٹر رائوں۔۔۔ یہ تو آپ کو خود ہی سوچنا ہو گا کہ آپ سے کیا غلطی ہوئی ہے۔۔۔ میں نہیں بتاؤں گا۔۔۔ اس لیے کہ اگر میں نے بتا دیا تو مزا نہیں آئے گا۔“

”اچھی بات ہے۔۔۔ میں سوچ لوں گا۔۔۔ نہ سوچ سکا تو پھر آپ کی خدمات حاصل کروں گا۔“ اس نے جلدی جلدی کہا۔

”ضرور۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔ لیکن میں اس سوال کا جواب پھر بھی نہیں دوں گا۔“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ رائوں نے منہ بنایا۔

”تجربہ کر کے دیکھ لیں۔“

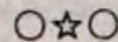
”مجھے وقت ضائع کرنے کا کوئی شوق نہیں۔۔۔ جب ضرورت

محسوس کروں گا۔۔۔ آپ سے پوچھ لوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

رائوں بنانے کے لیے مزا ہی تھا کہ بت سے قدموں کی آواز

سنائی دی۔



## چائے پی لیں

”آپ کے لیے ایک پیغام ہے۔“ فرحت فون کے پاس سے ہٹ کر ان کی طرف آتے ہوئی بولی۔

”اور وہ کیا؟“ انسپکٹر کامران مرزا چونک کر بولے۔

”آپ کی دارالحکومت میں ضرورت ہے۔۔۔ انکل جمشید کے ایک کارکن بات کر رہے تھے۔۔۔ پیغام خفیہ الفاظ میں تھا۔۔۔ جس کا مطلب ہے۔۔۔ وہ غیر یقینی حالات کا شکار ہے۔“

ایک۔۔۔ یہ سن کر مرزا نے۔۔۔ کچھ حالت معلوم ہو سکیں۔“ انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔۔۔ فون بوتھ کی طرف بڑھ گئے۔۔۔ تینوں نے ان کے ساتھ قدم اٹھائے۔۔۔ انہوں نے انسپکٹر جمشید کے گھر کے نمبر ملائے، کھنٹی بجتی رہی، لیکن کسی نے ریسپور نہ اٹھایا، اب خان رحمان کے گھر کے نمبر ملائے، لیکن دوسری طرف سے کسی نے ریسپور نہ اٹھایا۔۔۔ آخر انہوں نے تجربہ گاہ کے نمبر ملائے، وہاں بھی کسی نے ریسپور نہ اٹھایا۔

”حیرت ہے۔۔۔ سب کے سب آخر کیوں غائب ہیں۔۔۔ خان



رحمان کے گھر سے ظہور یا بیگم خان رحمان کو تو ریسپور اٹھانا چاہیے، تجربہ گاہ سے کسی ملازم کو ریسپور اٹھانا چاہیے۔ اچھا خیر۔۔۔ اکرام کے گھر تو کوئی ہو گا نا۔

یہ کہ کر انہوں نے اکرام کے گھر کے نمبر ملائے، لیکن اس کا فون بند تھا۔۔۔ کوئی آواز سنائی نہ دی۔

”اف مالک! یہ دارالحکومت میں کیا ہو رہا ہے۔۔۔ میرا خیال ہے۔۔۔ ہمیں سفید محل کو بھول کر دارالحکومت کا رخ کرنا پڑے گا۔“  
”بالکل۔۔۔ یہ ضروری ہے۔“

”اب انہوں نے دارالحکومت میں ایک دوست کے نمبر ملائے۔۔۔ ان کے اس دوست کے بارے میں بہت کم لوگوں کو معلوم تھا۔۔۔ سلسلہ جلد ہی مل گیا۔

”انشاء اللہ کمیتہ کون صاحب؟“ وہ بولے۔  
”فیاض شیخ بات کر رہا ہوں۔“  
”خدا کا شکر ہے۔۔۔ کسی کی آواز تو سنائی دی۔۔۔ میں کامران مرزا ہوں۔“

”اوہ! یہ آپ ہیں۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ کہاں سے بات کر رہے ہیں۔۔۔ دوسری طرف سے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا گیا۔

”آپ بات نہ پوچھیں، پہلے یہ بتائیں۔۔۔ یہاں کیا حالات ہیں؟“  
”صدر صاحب اور انسپکٹر جمشید کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔۔۔ کچھ

فوجی افسروں کو بھی گرفتار کیا گیا ہے۔۔۔ گرفتار شدگان کو نامعلوم جگہ پر رکھا گیا ہے۔۔۔ اور ملک میں مارشل لاء لگا دیا گیا ہے۔“  
”کیا۔۔۔ نہیں۔“ وہ چلائے۔

”ہاں جناب۔۔۔ یہاں کے حالات بالکل غیر یقینی ہیں۔“  
”اللہ اپنا رحم فرمائے۔“ وہ بولے۔۔۔ پھر انہوں نے کہا۔  
”انسپکٹر جمشید، خان رحمان اور پروفیسر داؤد کے گھر کے باقی افراد کے بارے میں کوئی پتا ہے۔“

”جی نہیں۔۔۔ انسپکٹر جمشید انہیں کچھ دیر پہلے نکال لے گئے تھے۔۔۔ اور انہیں کسی نامعلوم جگہ پر پہنچانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔“ اس نے جلدی جلدی بتایا۔

”تب پھر۔۔۔ وہ خود کس طرح گرفتار ہو گئے۔“  
”ابھی ابھی ریڈیو پر خبر ملی ہے۔۔۔ انہیں تھوڑی دیر پہلے ہی گرفتار کیا گیا ہے۔۔۔ وہ یہ سراغ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ملک کے خلاف سازش کس نے کی ہے۔۔۔ کہ پکڑے گئے۔“  
”ہوں اچھا۔۔۔ شکریہ۔۔۔ اس فون کال کے بارے میں آپ کسی کو نہ بتائیے گا۔“

”بالکل نہیں بتاؤں گا۔“ اس نے کہا۔  
ریسپور رکھ کر وہ ان کی طرف مڑے۔  
”اب ہمیں اسی وقت واپس جانا ہو گا۔۔۔ میں جہاز کا پتہ کرتا

ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن خبریں کیا ہیں۔“

”انسپکٹر کامران مرزا نے جلدی جلدی خبریں سنا ڈالیں۔۔۔ پھر دفتر معلومات کی طرف بڑھ گئے۔۔۔ واپس لوٹنے پر انہوں نے بتایا۔

”ایک گھنٹے بعد یہاں سے ایک جہاز دارالحکومت جائے گا۔۔۔

لیکن سنا ہے۔۔۔ وہاں کا ایئرپورٹ بند کر دیا گیا ہے۔۔۔ اگر یہ اطلاع درست ثابت ہوئی تو جہاز اوپر سے چکر لگا کر واپس آجائے گا۔“

”کیا مطلب۔۔۔ کیا ہم وہاں نہیں جاسکتے۔“

”ہاں! فی الحال نہیں جاسکتے۔“

”یا اللہ رحمہ۔۔۔ یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا۔“ فرحت نے تھرا کر کہا۔

کہا۔

”ہمارے ملک میں بس بیٹھے بٹھائے ہی ہوتا ہے۔۔۔ جو کچھ ہوتا

ہے۔“ آفتاب نے منہ بینایا۔

”مجھے سوچنے دو۔۔۔ آخر ہم کس طرح اپنے ملک۔۔۔ اے

ہاں۔۔۔ دارالحکومت کے علاوہ دوسرے شہروں میں پروازیں جا رہی ہیں یا

نہیں۔۔۔ پہلے تو یہ پوچھنا ہو گا۔“

یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر دفتر معلومات کی طرف چلے گئے۔۔۔ واپس

آکر انہوں نے بتایا۔

”ملک کے کسی بھی حصے میں کوئی پرواز نہیں جا رہی۔۔۔ نہ خشکی

کا سفر ہو سکتا ہے۔۔۔ نہ ٹرین کا۔۔۔ تمام راستے بند ہیں۔۔۔ مطلب یہ کہ

اس وقت ہمارا پورا ملک دنیا سے کٹا ہوا ہے۔“

”مارے گئے پھر تو۔۔۔ ہم ان کی مدد نہیں کر سکتے۔“ آفتاب بولا۔

”لیکن انہوں نے ہمیں آواز دی ہے۔۔۔ ہم وہاں ضرور جائیں

گے۔۔۔ کسی پرائیویٹ ہوائی کمپنی سے بات کرنا ہو گی۔“ وہ بولے۔

”جہاز پرائیویٹ کمپنی کس طرح ہمیں لے جاسکے گی۔۔۔ جب کہ

سرکاری جہاز تک نہیں جا رہے۔“ آصف بولا۔

”آصف! کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔“

”اوس نے چند پرائیویٹ ہوائی کمپنیوں کے پتے وہاں سے لیے

اور پھر فون بوتھ پر آ کر جٹ کئے۔۔۔ پہلے ایک کمپنی کے نمبر مائے۔

”دیکھیں جی۔۔۔ ہمیں پاک لینڈ جانا ہے۔“

”وہاں داخلہ بند ہے۔۔۔ حالات غیر یقینی ہیں۔“ دوسری طرف

سے کہا گیا۔

”یہ بات میں بھی جانتا ہوں۔“ انسپکٹر کامران مرزا نے جل کر

کہا۔

”تب پھر آپ کیوں یہ بات کہہ رہے ہیں۔۔۔ کیا آپ یہ سمجھتے

ہیں کہ آپ سے وصول ہونے والے کرائے کی خاطر ہم اپنی جانیں اور

جہاز کو خطرے میں ڈال دیں گے۔“

”نہیں! میں یہ نہیں کہتا۔۔۔ لیکن آپ پاک لینڈ سے ملنے والے



کسی بھی شریا دیہات میں تو ہمیں اتار سکتے ہیں نا۔۔۔ میرا مطلب ہے شار جستان کے۔۔۔

”ہاں! یہ ہو سکتا ہے۔۔۔ ہیلی کاپٹر پر آپ کو اس جگہ لے جا سکتے ہیں۔۔۔ لیکن کرایہ آپ کو بہت پڑے گا۔۔۔“

”کرایے کی آپ پروا نہ کریں۔۔۔ پہلے یہ بتائیں۔۔۔ آپ ہمیں کہاں اتاریں گے۔۔۔“

”یہ آپ ہم پر چھوڑ دیں۔۔۔ اس جگہ سے پاک لینڈ صرف پندرہ کلومیٹر دور رہ جاتا ہے۔۔۔ آپ کو سرحد تک جانے کے لیے سواری بھی مل جائے گی۔۔۔ لیکن سرحد عبور کرنا آپ کا کام ہو گا۔۔۔“

”وہ ہم کر لیں گے۔۔۔ آپ فکر نہ کریں، لیکن دیہات کا نام تو آپ کو بتانا چاہیے۔۔۔“

”اچھی بات ہے۔۔۔ ہم آپ کو راج گڑھ اتاریں گے۔۔۔“

”چلے ٹھیک ہے۔۔۔ ہمیں کہاں آنا ہے۔۔۔ ہیلی کاپٹر کس جگہ سے ملے گا۔۔۔“

”وہ بتانے لگا۔۔۔ آخر ریسپور رکھ کر وہ ان کی طرف مڑے۔۔۔“

”او بھئی چلیں۔۔۔ کچھ انتظام ہو گیا ہے۔۔۔“

وہ اسی وقت بتائے ہوئے پتے پر پہنچے۔۔۔ ہیلی کاپٹر انہیں تیار ملا۔۔۔ کرایہ وصول کرنے کے بعد انہیں اس پر بٹھا دیا گیا۔۔۔ پھر وہ اڑنے لگا۔۔۔ آخر انہیں ایک دیہات میں اتار دیا گیا۔

”شکریہ بہت بہت۔۔۔“

ایک دیہاتی سے انہوں نے سرحد کی سمت معلوم کی تو وہ کانپ گیا۔

”ادھر کا رخ نہ کرنا بابو جی۔۔۔“

”کیوں۔۔۔ کیا ہوا؟“

”حالات بہت گرم ہیں۔۔۔ فوجیں چوکس ہیں۔۔۔ ایسا لگتا ہے جیسے جنگ چھڑ جائے گی۔۔۔“

”آپ سمت بتا دیں۔۔۔ انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

”مت متلون کر کے وہ چل پڑے۔۔۔ آخر سرحد آگئی۔۔۔ انہیں شار جستان کے فوجیوں نے روک لیا۔

”آپ آگے نہیں جا سکتے۔۔۔ یہ سرحد ہے۔۔۔“

”جانتے ہیں۔۔۔ یہ دیکھئے۔۔۔ ہمارے کاغذات۔۔۔ ہم پاک لینڈ جا سکتے ہیں۔۔۔ ان پر تمام اندراجات مکمل ہیں۔۔۔“

”اوہو۔۔۔ وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔ پاک لینڈ کے فوجی آپ کو فوراً گولی مار دیں گے۔۔۔“

”نہیں ماریں گے۔۔۔ زیادہ سے زیادہ ہمیں گرفتار کریں گے۔۔۔ گرفتار ہونے کے بعد رہائی حاصل کرنا ہمارا کام ہو گا۔۔۔ وہ ہم کر لیں گے۔۔۔ اس طرف سے اسی لیے آنا پڑا کہ ایئر پورٹ بند ہیں۔۔۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ آپ کو ہمارے دفتر جانا ہو گا۔۔۔ وہاں آپ اپنے

کاغذات پر دستخط وغیرہ کروائیں گے۔ میں لگوائیں گے۔ یہ لکھ کر دیں گے کہ آپ کو کوئی نقصان پہنچا تو ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔  
”بالکل ٹھیک۔“ وہ بولے۔

”ان تمام کاموں سے فارغ ہو کر وہ سرحد کی طرف بڑھے۔  
شارجہاں کے فوجیوں نے اب انہیں سرحد عبور کرنے کی اجازت دے دی۔ ادھر پاک لینڈ کے فوجی انہیں گھور رہے تھے۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ کیا چکر ہے۔ جو نہی انہوں نے پاک لینڈ کی سرزمین پر پاؤں رکھا۔ ادھر سے فوراً کہا گیا۔

”خبردار! گولی مار دی جائے۔۔۔ واپس جاؤ۔“

الیکٹرک کامران مرزا نے ایک خاص انداز سے بازو اٹھایا۔  
”یہ ایک عجیب اشارہ دیا۔ فوجی چونک اٹھے۔

”یہ تو اپنے آدمی جان پڑتے ہیں۔ اچھا آپ لوگ آ سکتے ہیں۔ لیکن ہاتھ اوپر اٹھا کر آئیں۔“

”شکریہ“ یہ کہہ کر انہوں نے بازو اٹھا دیئے۔

اس طرح وہ اپنے ملک کی سرحد میں داخل ہوئے۔ انہیں فوراً گھیرے میں لے لیا گیا۔

”آپ کو پہلے چیک کیا جائے گا۔“

”ہاں ضرور کیوں نہیں۔“

انہیں ایک فوجی خیمے میں لایا گیا۔ خیمہ بہت بڑا تھا۔ اور وہاں

کوئی فوجی آفسر اپنے چند ماتحتوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔

”سرمے۔ یہ لوگ سرحد پار کر کے آئے ہیں۔“

”تو تم نے انہیں گولی کیوں نہیں ماری۔“ آفسر نے گرج کر کہا۔

”انہوں نے مخصوص اشارہ دے دیا تھا۔“

”اس کا مطلب ہے۔۔۔ آپ خود بھی پاک لینڈ کے فوجی ہیں۔“

اس کا لہجہ یک دم نرم ہو گیا۔

”نہیں۔ لیکن ہم پاک لینڈ کے خادم ضرور ہیں۔“

”کیا مطلب۔۔۔ اگر آپ فوجی نہیں ہیں تو پھر آپ کو فوجی

اشارے کیسے معلوم ہیں۔“

”مجھے تو شاید ایسے اشارے بھی معلوم ہوں گے۔ جو آپ کو

معلوم نہ ہوں۔“

”کیا مطلب۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ بھنا اٹھا۔

”مجھے الیکٹرک کامران مرزا کہتے ہیں۔ شاید آپ نے یہ نام سنا ہو

گا۔ ہمیں دارالحکومت جانا ہے۔“

”ادھر۔۔۔ یہ آپ ہیں۔“ وہ چلا اٹھا۔ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

سات گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ پھر بیٹھنے کے لیے کہا۔

”ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔“

”ایسے تو میں آپ کو اجازت نہیں دوں گا۔ چائے تو آپ پی کر

ہائیں گے۔“



”خیر... آپ کی مرضی... ملک کے حالات کیا ہیں؟“  
 ”آپ کو نہیں معلوم۔“

”ہم ایک غیر ملکی مہم میں شارجہاں میں پہنچے ہی تھے کہ یہ خبر ملی... لہذا ہم نے فوراً واپسی کی ٹھانی۔“

”ہوں... ملک اس وقت فوج کے ہاتھوں میں ہے۔“  
 ”لیکن ایسا اچانک کیسے ہو گیا؟“

”ہم کیا بتا سکتے ہیں سر... ہم لوگ تو بس سرحدوں پر موجود ہیں اور یہ بات جانتے ہیں کہ صبح سے شام تک ہمیں کیا کرنا ہے۔“  
 ”ہوں! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“

انہیں چائے پیش کی گئی... آصف، آفتاب اور فرحت نے پائے کے کپوں کی طرف ہاتھ بڑھائے ہی تھے کہ انسپکٹر کامران بول اٹھے۔  
 ”ایک منٹ... اس چائے میں اگر زہر نہیں ہے تو کم از کم بے ہوشی کی دوا تو ضرور ہے۔“

”کیا مطلب؟“ آفیسر زور سے اچھلا۔  
 ”آپ میرے اندازے کی داد دیں گے نا۔“ وہ مسکرائے۔

”میرا نام کیپٹن ساغر ہے۔“  
 ”یہ بتانے کی اچانک کیا ضرورت پیش آگئی۔“ انہوں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”چائے پی لیں۔“ اس نے سرد آواز میں کہا۔  
 ”آخر کیوں؟“

”آپ اگر بے ہوش نہیں ہوں گے تو پھر زنجیروں میں جکڑ کر آگے بھیجنا پڑے گا۔“

”یہ کیا بات ہوئی... ہم نے کیا جرم کیا ہے؟“  
 ”یہ بات آپ کو ہمارے آفیسر بتائیں گے... ہمیں تو ہدایات صرف یہ ہیں کہ اگر انسپکٹر کامران مرزا اور ان کے بچے سرحد عبور کر لیں تو انہیں ملٹری ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا جائے۔ لیکن بے ہوشی کی حالت میں یا زنجیروں میں۔“

اگر آپ کہتے ہیں تو پھر ہم زنجیریں پہن لیتے ہیں... ہم بے ہوشی کی حالت میں جانا پسند نہیں کریں گے۔“  
 ”اچھی بات ہے... آپ کی مرضی۔“

اور پھر انہیں واقعی زنجیروں میں جکڑا گیا... ایک بڑی فوجی گاڑی میں لادایا گیا اور گاڑی وہاں سے روانہ ہو گئی... کئی گھنٹوں کے سفر کے بعد ٹرک رک گیا... انہیں اتارا گیا... اس وقت انہوں نے دیکھا... وہ ملٹری ہیڈ کوارٹر میں کھڑے تھے۔

”آپ کو ہمیں یہاں تک لانے کا حکم تھا... ہم جا رہے ہیں... آپ جانیں... یہاں کے حکام جانیں۔“

”ارے ارے... یہ کیا... کیا ہمیں کسی کے حوالے کر کے نہیں

جائیں گے۔“ آصف چلایا۔

”نہیں۔۔۔ حکم یہ تھا کہ ہیڈ کوارٹر کے صحن میں چھوڑ کر واپس آ

جائیں۔۔۔ لہذا ہم واپس جا رہے ہیں۔“

”عجیب ہیں آپ لوگ۔۔۔ خیر۔۔۔ تشریف لے جائیے۔۔۔ آپ کا

بست بست شکریہ۔۔۔ یہاں تک تو پہنچایا۔۔۔ یوں بھی ہمیں دارالحکومت

تک ہی آنا تھا۔“

ٹرک چلا گیا۔۔۔ وہ زنجیروں میں جکڑے کھڑے رہے۔۔۔ فوجی ان

کے آس پاس سے گزرتے رہے۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں کوئی

دیکھ ہی نہ رہا ہو۔۔۔ جیسے وہ وہاں کھڑے ہوئے بھی نہ ہوں۔۔۔ زنجیروں

میں جکڑے ہوئے نہ ہوتے تو ادھر ادھر ہو جاتے۔

”میرے بھائی! انہیں کھ لیا۔۔۔ یلین پر بھی انہوں نے زور کیا

پہلوان رکھا۔۔۔ آخر جتن خنجر اسم کے لوگ اسیں ایسی صوبہ

نظر آئے۔“

○☆○

جی۔۔۔ نہیں

رائور نے نظریں اٹھائیں۔۔۔ چند فوجی چلے آ رہے تھے۔۔۔ ان

کے گھیرے میں کچھ لوگ زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔۔۔ وہ بری

طرح لمولہان تھے۔۔۔ نزدیک آنے پر انہیں پہچانا جاسکا۔۔۔ انسپکٹر جمشید تو

کانپ کر رہ گئے۔۔۔ کیونکہ وہ انسپکٹر کامران مرزا، آفتاب، آصف اور

فرحت تھے۔

”اف مالک۔۔۔ آپ کا یہ حال کس نے کیا؟“

”ہمارے فوجیوں نے۔۔۔ لیکن میرا خیال ہے۔۔۔ وہ مسلمان فوجی

نہیں تھے۔“ انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

”آپ کا مطلب ہے۔۔۔ عیسائی تھے یا پھر مرزائی۔“

”ہاں بالکل۔۔۔ آخر ہماری فوج میں یہ لوگ بھی تو ہیں۔۔۔ اور یہ

ملک کے خلاف ہی کچھ کریں گے۔۔۔ ملک کی ہمدردی میں تو کچھ کرنے

سے رہے۔“

”ہوں! بالکل ٹھیک ہے۔“

اور پھر انہیں ایک کوٹھری میں پہنچا دیا گیا۔۔۔ صدر بھی وہیں



تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر اداس انداز میں مسکرائے۔  
 ”تو تم لوگ بھی آگئے۔۔۔ لیکن نہیں۔۔۔ تمہارے بچے کہاں ہیں۔“

”میں اور وہ الگ الگ سمت میں کام کر رہے تھے۔۔۔ لہذا ایک وقت میں تو یہاں نہیں آ سکتے تھے۔“

”ہوں! ٹھیک ہے۔۔۔ مطلب یہ کہ وہ بھی آجائیں گے۔“

”لگتا تو ایسا ہی ہے۔۔۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔“

”یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟“

”ہمارے ملک پر غیر ملکی حکمران ہوں اور بس۔“

”سوال یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں۔۔۔ اپنے اوپر عائد کردہ الزام کس طرح دھوئیں۔۔۔ یہ لوگ تو ہمیں کسی عدالت میں پیش نہیں کریں گے۔“

”جشید۔۔۔ اس کا علاج صرف اور صرف بغاوت ہے۔۔۔ اور تم جانتے ہی ہو۔۔۔ بغاوت کی سزا موت ہے۔۔۔ مطلب یہ کہ اگر ہم اپنی بغاوت میں کامیاب نہ ہو سکے تو پھر ہمیں بغاوت کے جرم میں پھانسی دی جائے گی۔۔۔ اور میرا خیال ہے یہی ان کا پروگرام ہے۔“ صدر صاحب نے جلدی جلدی کہا۔

”نہیں! میرا خیال ہے ان کا پروگرام کچھ اور ہے۔“ انسپکٹر جشید نے انکار میں سر ہلایا۔

”یہ بات تم اتنے یقین سے کیے کہ سکتے ہو۔“

”میں اور بھی کئی باتیں اتنے یقین سے کہہ سکتا ہوں۔“ وہ مسکرائے۔

باقی لوگ بھی مسکرانے لگے۔۔۔ یہ دیکھ کر صدر صاحب کو بھی مسکرانا پڑ گیا۔۔۔ لیکن شاید ان کا جی مسکرانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔۔۔ اس لیے وہ بہت عجیب سے انداز میں مسکرائے۔  
 ”جشید! میں حد درجے سنجیدہ ہوں۔“

”ہم سب سنجیدہ ہیں۔۔۔ لیکن یہ سنجیدگی ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی۔۔۔ اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم خود کو بالکل ٹھنڈا رکھیں۔۔۔ جوش میں نہ آئیں۔۔۔ صرف ہوش سے کام لیں۔۔۔ کیونکہ جوش میں آکر ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔۔۔ ہاں جوش میں رہ کر شاید بہت کچھ کر سکیں۔“

”میں انسپکٹر جشید کی تائید کرتا ہوں۔“ انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

”اور ہم سب اداسی محسوس کر رہے ہیں۔“ آفتاب ایسے میں بول اٹھا۔

”کیا مطلب۔۔۔ یہاں جیل میں اداسی نہیں تو کیا خوشی محسوس کرو گے۔“ انسپکٹر کامران مرزا ان کی طرف مڑے۔

”میرا مطلب ہے۔۔۔ یا تو باقی چھوٹی پارٹی بھی یہاں ہوتی۔۔۔ یا ہم

بھی باہر ہوتے۔۔۔ اور ان سے گپ شپ لگا رہے ہوتے۔۔۔  
 ”حد ہو گئی۔۔۔ ان لوگوں کو ایسے میں گپ شپ کی پڑی ہے۔“  
 صدر صاحب نے جھلا کر کہا۔  
 ”آپ کو شاید معلوم نہیں۔“ انپکٹر جمشید مکرائے۔  
 ”کیا معلوم نہیں۔“ وہ فوراً بولے۔  
 ”یہ کہ ان کی گپ شپ بعض اوقات کئی باتیں سمجھا دیتی ہے۔“

”میرے سامنے ایسا ہو تو مانوں۔“

”سن رہے ہو۔“ انپکٹر کامران مرزا ان کی طرف مڑے۔

”جی ہاں! سن تو رہے ہیں۔۔۔ لیکن ہم ناکمل ہیں۔۔۔ ہماری تعداد پورے پورے۔۔۔ پھر صدر صاحب کو پناہ گپ شپ سنائیں گے۔۔۔ اور اس وقت دیکھئے گا۔۔۔ کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں ہوتا۔“  
 آصف نے جلدی جلدی کہا۔

”چلو ٹھیک ہے۔۔۔ فی الحال تو انہیں سوچنے دیجئے ہیں کہ اب ہم کیا کریں۔“

”کرنا کیا ہے۔۔۔ یہاں سے نکلتا ہو گا۔“ انپکٹر جمشید بولے۔

”اور کیا ہم یہاں سے نکل سکیں گے جمشید۔“

”در اصل میں نے خود کو ایسی لے ان کے حوالے کیا تھا کہ مجھے یہ لوگ یہاں پہنچا دیں۔۔۔ تاکہ میں آپ کو یہاں سے نکالنے کے لیے

کچھ کر سکوں۔۔۔ اور یہ اچھا ہو گیا کہ انپکٹر کامران مرزا بھی یہاں آ گئے۔۔۔ اب ہم مل کر یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔“  
 ”شکریہ انپکٹر صاحب۔“ کوٹھری سے آواز ابھری۔  
 وہ اچھل پڑے۔۔۔ آواز رانور کی تھی۔  
 ”یہ کس کی آواز تھی؟“ انپکٹر کامران مرزا بولے۔  
 ”مسٹر رانور کی۔۔۔ ہمارے لیے ایک نیا قتنہ۔“  
 ”نیا قتنہ۔۔۔ کیا مطلب؟“

”جیرال“ ابطال اور جونٹ سے زیادہ پریشان کرنے والا۔۔۔ اگرچہ اس کے پاس عقل اتنی نہیں جتنی جیرال اور ابطال کے پاس ہے۔۔۔ انہوں نے منہ بنایا۔

”لیکن۔۔۔ یہ آپ کا شکریہ کس بات کا ادا کر رہے ہیں۔“  
 آصف نے حیران ہو کر کہا۔  
 ”اس بات کا کہ میں نے اسے بتا دیا۔۔۔ اس نے کیا غلطی کی ہے۔“

”گو کیا آپ کو یہاں لا کر اس نے غلطی کی ہے۔“ آفتاب بولا۔  
 ”ہاں! میرا یہی خیال ہے۔“

”بالکل غلط خیال ہے۔۔۔ انپکٹر جمشید۔۔۔ آپ یہاں سے نکل ہی نہیں سکتے تو میری غلطی کیسے گنی جائے گی۔“ رانور کی آواز ابھری۔  
 ”بالکل ٹھیک۔۔۔ لیکن اگر ہم نکل گئے تو۔“ انپکٹر جمشید



مسکرائے۔

”ہاں! اس صورت میں میں اپنی غلطی مان لوں گا۔“

”چلو ٹھیک ہے۔۔۔ اب تم اپنی غلطی ماننے کی تیاری کرو۔۔۔ ہم یہاں سے نکلنے کی تیاری کرتے ہیں۔۔۔ دیکھنا یہ ہے کہ کس کی تیاری کیا گل کھلاتی ہے۔“ آصف نے جلدی جلدی کہا۔

”لیجئے۔۔۔ اب تیاری صاحب بھی گل کھلائیں گی۔۔۔ پھر وہ کیا جائے جو گل نہیں کھلائے گا۔“ آفتاب نے برا سامنہ بنایا۔

”صدر صاحب کی ہنسی نکل گئی۔۔۔ پھر انہوں نے اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہا۔

”بھئی ایسی باتیں نہ کرو۔۔۔ جنسے کہ جی نہیں چاہ رہا۔“

”تی بہت بہتر۔۔۔ اب ایسی کوئی بات نہیں کہیں گے۔۔۔ لیکن انجانے میں کوئی ایسی بات ہو جائے تو ہمیں معاف کر دیجئے گا۔“ آفتاب مسکرایا۔

”خود بخود کوئی بات کس طرح ہو سکتی ہے۔۔۔ جب تک تم کرو گے نہیں۔“ صدر کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

”آپ سمجھے نہیں۔۔۔ منہ سے کوئی بات اگر نکل گئی تو۔“ فرحت نے وضاحت کی۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ وہ اور بات ہے۔“ صدر صاحب نے فوراً کہا۔  
”وہ اور بات نہیں ہے سر۔“ انپکڑ کامران مرزا نے گویا انہیں

خبردار کیا۔

”کیا مطلب۔۔۔ تو پھر وہ کیا بات ہے۔“

”ایسی تمام باتیں تو ان کے منہ سے خود بخود ہی نکلتی ہیں۔۔۔ یہ جان بوجھ کر نہیں کرتے۔“

”ارے باپ رے۔“ صدر صاحب گھبرا گئے۔

باقی لوگ ہنس پڑے۔ پھر سب یک لخت سنجیدہ ہو گئے کیونکہ صدر صاحب حد درجے سنجیدہ نظر آنے لگے تھے۔

”ذرا سوچیں۔۔۔ ملک پر اس وقت کیا گزر رہی ہے۔۔۔ عوام پر کیا گزر رہی ہے۔۔۔ ملک غیروں کے قبضے میں چلا گیا اور ہم یہاں بیٹھ کر نہیں۔۔۔ نہیں جی چاہتا ہنسنے کو۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔۔۔ لیکن آپ انہیں نہیں جانتے۔۔۔ یہ عجیب لوگ ہیں۔“ انپکڑ جوشید بولے۔

”کن کی بات کر رہے ہیں آپ۔۔۔ ان بچوں کی۔“ وہ پھر حیران ہو کر بولے۔

”ہاں سر۔۔۔ یہ عجیب لوگ ہیں۔۔۔ موت کے لمحات میں بھی ایسی باتیں کر جاتے ہیں۔۔۔ اور سچ تو یہ ہے۔۔۔ مشکل ترین حالات میں ہمیں ان کی باتیں بہت سارا دیتی ہیں۔۔۔ ہم اپنے دماغوں سے ماحول کی سنگینی کو نکال بھیجتے ہیں اور اس طرح کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔“

”خیر بھئی۔۔۔ تم جانو۔ اگر تم انہیں اجازت دیتے ہو تو میں بھی نہیں روکوں گا۔۔۔ لیکن میں ہنسنے میں تم لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔“

”ٹھیک ہے سر۔۔۔ آپ سے کہہ کون رہا ہے کہ ان کی باتوں پر نہیں۔۔۔ بلکہ ہمیں تو خود اکثر اوقات ان کی باتوں پر غصہ آنے لگتا ہے۔“ انسپٹر کامران، مرزا مسکرائے۔

”بالکل غلط ابا جان۔“ آفتاب نے جل کر کہا۔

”ہائیں۔۔۔ تم میری بات کو غلط کہہ رہے ہو۔“ انسپٹر کامران مرزا بھنا اٹھے۔

”دیکھئے انکل صدر۔۔۔ آگیا نا انہیں غصہ میری بات پر۔۔۔ کس قدر جلد ثبوت فراہم کرایا میں نے۔۔۔ ویسے میں اس وقت کہنا یہ چاہتا تھا کہ ہماری باتوں پر انہیں اکثر اوقات نہیں۔۔۔ بعض اوقات غصہ آتا ہے۔“

”اس میں کیا فرق ہے بھئی۔۔۔ اکثر اوقات اور بعض اوقات میں۔۔۔ میری اردو بہت کمزور ہے۔“ صدر صاحب نے حیران ہو کر کہا۔

”دیکھا آپ نے۔۔۔ آپ ان کی باتوں میں آگئے۔“ انسپٹر صاحب نے ہنس کر کہا۔

”بلکہ میں آپ سے یہ کہوں گا کہ آپ ان کی باتوں کے کھیرے میں آگئے۔“

”ویسے سچ یہ ہے کہ۔“ صدر صاحب کہتے کہتے رک گئے۔

”جی فرمائیے۔ سچ تو یہ ہے کہ؟“

”کہ۔۔۔ اب مجھے بھی ان کی باتوں میں مزا سا آنے لگا ہے۔“

”واہ۔۔۔ یہ ہوئی نا بات۔۔۔ لیکن صدر انکل۔۔۔ ابھی تو ہماری

باتیں شروع ہی نہیں ہوئیں۔۔۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ابھی ہم نامکمل ہیں۔“

”کیا کہا۔۔۔ نامکمل؟“ صدر صاحب بولے۔

”جی۔۔۔ وہ۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ ہماری تعداد پوری نہیں ہوئی۔“

”خیر۔۔۔ وہ تو بہت جلد ہونے والی ہے۔“ رائٹر کی آواز ابھری۔

”ہائیں مسٹر کانور۔۔۔ آپ بھی ہماری باتیں سن رہے ہیں۔“

آفتاب چلانے کے انداز میں بولا۔

”کیا کہا۔۔۔ کانور۔“ انسپٹر جمشید بوکھلا اٹھے۔

”کوئی بات نہیں۔۔۔ یہ میرے نام کے ساتھ جو جی چاہے سلوک

کریں۔۔۔ مجھے غصہ نہیں آئے گا، اس لیے کہ مجھے غصہ آتا ہی

نہیں۔۔۔ اور یہی میری کامیابی کا راز ہے۔“

”تو آپ یہاں ہماری باتیں سن کر رہے ہیں۔“

”ہاں! فارغ ہو ہوں۔۔۔ کرنے کو کوئی کام ہی نہیں۔۔۔ آپ لوگ

کوئی بل جل کریں تو میں کچھ کرنے کی کوشش کروں گا نا۔“



”ابھی ہمارا آرام کرنے کا موڈ ہے۔ کام کا جب موڈ ہو گا۔۔۔ حرکت میں آئیں گے۔ اور اس طرح آئیں گے۔ کہ آپ بھی مسٹر ٹاور یاد کریں گے۔“ آصف نے جل بھن کر کہا۔

”بھئی ٹاور نہیں۔۔۔ رائور۔“ انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

”شکریہ اٹکل۔۔۔ مان گیا آپ کو۔“

”اس میں مان جانے والی بات کہاں سے پیدا ہو گئی۔“ صدر صاحب کے لہجے میں حیرت ہی حیرت تھی۔

”باتیں پیدا نہیں ہوتیں اٹکل صدر۔۔۔ بلکہ پیدا کی جاتی ہیں۔۔۔ اور یہ ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔“

”اور تمہارے دائیں ہاتھ کا کھیل کیا ہے؟“ رائور کی آواز سنائی دی۔

”آپ کی آواز سے غصہ جھانک رہا ہے۔“ فرحت نے گویا اعلان کیا۔

”نہیں تو۔۔۔ غصہ تو میرے پاس بھی نہیں آتا۔“

”تو اگر ہم آپ کو غصہ دلا دیں۔“

”تو میں آپ کو اس جیل سے نکال دوں گا۔“

”کیا کہا۔۔۔ آپ ہمیں اس جیل سے نکال دیں گے۔“ آصف چونک کر بولا۔

”ہاں بالکل۔۔۔ میں اپنے وعدے کا بہت پکا ہوں۔“

”ہوں گے۔ ہمیں کیا معلوم۔۔۔ عملی طور پر ثابت ہوں گے تو ہم تسلیم کریں گے۔“ آفتاب نے جلدی جلدی کہا۔

”اچھی بات ہے۔ تم مجھے غصہ دلاؤ۔۔۔ میں یہاں سے نکال کر دکھا دوں گا۔“

”غصہ تو خیر آپ کو آ رہا ہے۔“ آفتاب ہنسا۔

”نہیں آ رہا۔“ وہ بولا۔

”سامنے آکر بات کریں۔ تاکہ سب کو معلوم ہو کہ غصہ آ رہا ہے یا نہیں۔“ فرحت نے کہا۔

”ایک منٹ۔۔۔ پہلے میری ایک بات سن لو۔“ ایسے میں انسپکٹر جمشید کی آواز ابھری۔

”جی فرمائیے۔ ایک نہیں دس فرمائیے۔“ آفتاب ان کی طرف مڑا۔

”نہیں۔۔۔ اس وقت صرف ایک۔“

”چلئے خیر۔۔۔ کر لیں گے ہم گزارش۔“ آفتاب نے گنگناتے ہوئے انداز میں کہا۔

”ہاں تو پھر۔۔۔ وہ ایک بات کیا ہے۔“

”ہم بھیک میں ملنے والی رہائی نہیں لیں گے۔ اپنے زور بازو سے نکلیں گے یا بیس رہیں گے۔ چاہے مسٹر رائور کو غصہ آئے یا نہ آئے۔“

”بات یہ بھی مستقل ہے۔“ انپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔  
 ”پھر ہم کیوں انہیں غصہ دلائیں۔ کیا کریں گے ہم غصہ دلا کر۔۔۔ اور کیا کریں گے یہ غصے میں آکر۔“ آفتاب نے براسامہ بنایا۔  
 ”بھئی تم دلاؤ مجھے غصہ۔ میں صرف تم لوگوں کو جیل سے نکال دوں گا۔“ رائور نے نئی بات کی۔

”کیا بات کرتے ہیں۔۔۔ ہم اپنے باقی ساتھیوں کو یہاں چھوڑ کر رہائی قبول کر لیں گے۔ ناممکن۔“ فرحت نے جھلا کر کہا۔  
 ”چلے تھے مجھے غصہ دلانے۔۔۔ خود غصے میں آرہے ہیں۔“ رائور نے قہقہہ لگایا۔

”بھئی تم یس آکر بات کیوں نہیں کر لیتے۔۔۔ دور بیٹھ کر باتیں کرنے کی کیا ضرورت۔۔۔ کیا ہم سے خوف زدہ ہو۔“ انپکٹر جشید نے سرسری انداز میں کہا۔

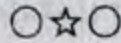
”خوف زدہ۔۔۔ اور آپ سے۔۔۔ آپ بھی کیا بات کرتے ہیں۔۔۔ آپ میں تو خوف زدہ کرنے والی ایک بات بھی نہیں ہے۔۔۔ پتا نہیں کیوں۔۔۔ ہمارے بڑے بڑے ساتھی آپ لوگوں سے خوف کھاتے رہے ہیں۔۔۔ آپ کو ان لوگوں نے ہوا بنا رکھا ہے۔۔۔ لیکن آپ تو میرے ایک ہاتھ کی بھی مار نہیں ہیں۔“

”وہ بڑے بڑے ساتھی عقل سے پیدل نہیں تھے۔۔۔ اور تمہاری سب سے بڑی کمزوری ہی یہ ہے کہ تم عقل سے پیدل ہو۔۔۔ ہم تمہیں

اپنی عقل سے شکست دیں گے۔“  
 ”میں اس دن کا بے چینی سے انتظار کروں گا۔“  
 عین اس لمحے سانپ کی پھٹکار گونجی۔  
 ”ارے! یہ کیا۔ کیا اس جیل میں کہیں سانپ بھی ہیں۔“  
 ”کہیں کیا۔ آپ کی کوٹھری میں پھنیر سانپ موجود ہیں۔“  
 رائور ہنسا۔

”کیا۔۔۔ نہیں!!!“

وہ ایک ساتھ چلائے۔۔۔ اور پھر ان کی آنکھوں سے بے تحاشہ خوف جھانکنے لگا۔۔۔ کیونکہ اس لمحے کوٹھری میں ایک سوراخ نمودار ہوا تھا۔۔۔ اور اس میں سے ایک سیاہ ناگ کا سر باہر نکلا تھا۔





## جھر جھری کی مار

محمود نے دروازہ کھول دیا، لیکن دروازے پر اسے کوئی بھی نظر نہ آیا۔  
 ”ہائیں! یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔“ اس کے منہ سے نکلا۔  
 ”کیا مطلب۔۔۔ تو پھر دستک کس نے دی تھی۔“ فاروق نے حیرت سے کہا۔  
 ”شاید کسی بچے نے شرارت کی ہو گی۔“ یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔

عین اس وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔  
 ”اوہو۔۔۔ کیا مصیبت ہے بھی۔“ محمود نے چل کر کہا اور پھر ایک دم دروازہ کھول ڈالا۔ اب بھی انہیں کوئی نظر نہ آیا۔  
 ”میں ذرا باہر نکل کر دیکھتا ہوں، ورنہ یہ حضرت تو ہمیں بلا وجہ پریشان کریں گے۔“

یہ کہہ کر محمود باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کی دیکھا دیکھی فاروق اور فرزانہ بھی باہر نکل گئے۔ عین اسی لمحے دروازہ بند ہو

گیا۔

”ارے ایہ دروازہ کس نے بند کر دیا۔۔۔ اپنے باقی ساتھیوں کو تو ہم نے ایک کمرے میں بند کر دیا ہے۔“

”کوئی ان میں سے نکل آیا ہو گا۔“ فاروق نے فوراً کہا۔

”دماغ تو نہیں چل گیا۔“ محمود اس کی طرف الٹ پڑا۔

”اب تم کیا چاہتے ہو۔۔۔ ان حالات میں دماغ کی بجائے اور کیا چیز چلے۔“ فاروق نے برا سامنہ بنایا اور فرزانہ ہنسنے لگی۔

”لو۔۔۔ اب تم ہنسنے لگیں فرزانہ۔۔۔ جب کہ ہم سنگین ترین حالات کا شکار ہیں۔“

”بھئی آخر کریں کیا۔۔۔ آؤ۔۔۔ دستک دیتے ہیں۔۔۔ کوئی تو ہے۔۔۔ جس نے دروازہ بند کیا ہے۔“

تینوں دروازے پر آئے۔ محمود نے دستک دی۔ لیکن اندر سے کوئی نہ بولا۔

”بھئی کیوں مذاق کر رہے ہو۔۔۔ ہم پہلے ہی بہت ستائے ہوئے ہیں۔۔۔ دروازہ کھول دو، ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔“ فاروق بولا۔

”کیا کہا۔۔۔ کچھ نہیں کہیں گے۔“ محمود نے اسے گھورا۔

”تو اس میں گھورنے کی کیا ضرورت پیش آگئی۔“ فاروق نے گہرا کر کہا۔

”ضرورت پیش آنے کی بھی ایک ہی کمی۔۔۔ بھئی ضرورت کا کیا

ہے۔۔۔ وہ تو یوں بھی ایجاد کی ماں ہے۔۔۔ کسی لمحے بھی پیش آ سکتی ہے۔۔۔“ فرزانہ نے شوخ انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ مجھے کیا۔۔۔ محمود نے کندھے اچکائے۔

”یہ تم نے کیا کہا۔۔۔ مجھے کیا۔۔۔“

”ہاں! ہانک لو ادھر ادھر کی۔۔۔ میں بتا دوں گا اباجان کو۔۔۔ کہ تم ان حالات میں بھی سنجیدہ نہیں ہوئے تھے۔“ اس نے جملے کٹے انداز میں کہا۔

”یہ بات تو انہیں پہلے ہی معلوم ہے۔“

محمود نے تھملا کر ایک بار پھر دروازے پر ہاتھ مارا۔۔۔ دروازہ کھل گیا۔۔۔ وہ یک دم اندر داخل ہو گئے۔۔۔ کسی نے پھر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

”ٹک۔۔۔ ٹک۔۔۔ کون۔۔۔ کون ہے۔“ وہ خوف زدہ آواز میں بولے۔

”ڈرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ یہ میں ہوں۔“ ایک آواز ابھری۔

”ٹک۔۔۔ ٹک۔۔۔ کون۔۔۔ یعنی کہ کون۔“ فاروق نے کانپتی آواز

میں کہا۔

”ایکٹنگ کرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ میں جانتا ہوں۔۔۔ تم ذرا

بھی خوف زدہ نہیں ہو۔“

”ہائیں۔۔۔ تو۔۔۔ غلب۔۔۔ ظال انکل ہیں کیا آپ۔“ فاروق نے

چلا کر کہا۔

”خوب پہچانا۔۔۔ داد دیتا ہوں۔۔۔ آپ کو ایک اطلاع دیئے چلا آیا تھا۔۔۔ ورنہ میری ڈیوٹی تو دوسری طرف ہے۔“

”آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ہمارا اتنا احساس کیا۔“ محمود نے فوراً کہا۔

”آپ کے باقی ساتھی۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ انسپکٹر کامران مرزا پارٹی، انسپکٹر جمشید اور صدر صاحب۔۔۔ ہر نائی جیل میں ہیں۔۔۔ راتوں ان کے سروں پر مسلط ہے۔۔۔ وہ انہیں جیل سے نہیں نکلنے دے گا۔۔۔ اس بات کی میں گارنٹی دیتا ہوں۔“

”کیا مطلب۔۔۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں مسٹر انظال۔“

”اگر تم پسند کرو تو میں تم لوگوں کو بھی وہاں پہنچا دیتا ہوں۔۔۔ چاہو تو دروازہ کھلو اور خود و ماں چنے حاو۔۔۔ سموت کا کوئی آدمی تمہاری مدد نہیں کرے گا۔۔۔ آپ چائیں تو صرف ہم آپ لوگوں کی مدد کر سکتے ہیں۔“

”ہم پر اتنی مہربانیاں کیوں؟“

”میرا خیال ہے۔۔۔ پہلے تم سب ایک جگہ جمع ہو جاؤ۔۔۔ پھر بات کر لیں گے۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“ محمود نے کہا۔

”تو پھر۔۔۔ اس عمارت کے کچھلی طرف ایک بڑی گاڑی موجود ہے۔۔۔ چل کر اس میں بیٹھ جائیں۔۔۔ کوئی گڑبڑ کریں گے تو آپ کے



حق میں معترفت ہو گی۔ ہمارا کچھ نقصان نہیں ہو گا۔ اس لیے کہ پورے ملک کی باگ ڈور ایک طرح سے ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ بظاہر ملک پر فوج کا قبضہ ہے۔ لیکن فوج کا سربراہ اور بڑے بڑے آفیسر اس وقت ہمارے اشاروں پر ٹاپنے پر مجبور ہیں۔

”ٹھیک ہے۔ ہم کوئی شرارت نہیں کریں گے۔“

وہ چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی چل پڑی۔ کئی گھنٹوں کے سفر کے بعد آخر انہیں بھی ہرٹائی کی کوٹھری میں پہنچا دیا گیا۔

”ہمیں پہلے ہی امید تھی۔ آخر تم بھی یہاں آ جاؤ گے۔“

انسپکٹر جشیہ مسکرائے۔

”کیا آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ہمیں یہاں کون لایا ہے۔“

”نہیں۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے۔ ابوال یا جوناٹ لایا ہو گا۔“

”بالکل ٹھیک۔ مسٹر ابوال لائے ہیں۔ وہ ہم سے کچھ کام لینا چاہتے ہیں۔“

”تو اب یہ کھل کر سامنے آنے لگے ہیں۔“

”ہاں بالکل۔ میں صاف صاف بات کرنا چاہتا ہوں۔ مسٹر جیرال نے مجھے آپ سے بات چیت کے لیے مقرر کیا ہے۔“ ابوال کی آواز ابھری۔

”فرمائیے۔“ وہ بولے۔

”آپ کا ملک ہمارے قبضے میں ہے۔ آپ خود ہمارے قبضے میں ہیں۔ مسٹر انور جیسا شخص آپ کے سروں پر مسلط ہے۔ آپ لوگ بالکل بے بس ہیں۔ کچھ نہیں کر سکتے۔“

”یہ آپ کا خیال ہے۔ اور آپ اپنا خیال ہم پر ٹھونس رہے ہیں۔“ انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

”جئے خیر۔ یونہی سہی۔ یہ میرا خیال ہے۔ آپ اسے غلط ثابت کر دیں۔ لیکن میری بات سننے کے بعد۔“

”اچھا خیر۔ آپ کہئے۔“

”انسپکٹر کامران مرزا۔ پہلے آپ انہیں اس پھول کے بارے میں بتادیں۔“

”تک۔ کیا۔۔۔ کہا مجھے۔۔۔ پھول۔“

انسپکٹر کامران مرزا اچھل پڑے۔ آنکھوں میں حیرت دوڑ گئی۔

”ہاں! پہلے آپ اس پھول کے بارے میں انہیں بتادیں۔۔۔ پھر میں اپنی بات آگے بڑھاؤں گا۔“

”اچھی بات ہے۔“ انہوں نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا اور پھر اپنے ساتھیوں کو پھول کی کہانی سنانے لگے۔ کہانی پوری کرنے کے بعد آخر کار انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

”فرمائیے۔ اب آپ کیا چاہتے ہیں۔“

”دنیا کے بڑے بڑے تمام ملک اس پھول سے پریشان ہیں۔“

ابطال کی آواز سنائی دی۔

”یہ کیا بات ہوئی۔“ انپکٹر جشید نے منہ بنایا۔

”یہ بات اس طرح ہوئی کہ۔۔۔“

عین اس لمحے ایک عجیب بات ہوئی۔۔۔ پروفیسر داؤد تڑپ کرے اور بے ہوش ہو گئے۔۔۔ وہ گھبرا گئے۔

”انہوں نے مجھے دیکھنے کی کوشش کی تھی۔“ ابطال کے لہجے میں خوف تھا۔

”کیا مطلب۔۔۔ بھلا انہوں نے کس طرح کوشش کر ڈالی۔“

”اسی پر مجھے حیرت ہے۔“

”کیا کہا۔۔۔ اس بات پر آپ کو حیرت ہے مسٹر ابطال۔۔۔ ہماری

سمجھ میں تو یہ بات بھی نہیں آئی۔“

”خود میں بھی نہیں سمجھ سکا کہ انہوں نے مجھے دیکھنے کی کوشش

کس طرح کی۔۔۔ لیکن میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کر دیا کہ یہ مجھے

دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”تب پھر آپ نے انہیں بے ہوش کس طرح کر ڈالا۔“

”یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔۔۔ چاہوں تو آپ سب کو بھی

بے ہوش کر دوں۔“ ابطال نے ہنس کر کہا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔۔۔ کرنا چاہیں تو کر دیں۔۔۔ ہمیں کوئی پروا

نہیں۔“

”ایسا کرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ مجھے آپ سے بات مکمل کرنا ہے۔۔۔ ہاں تو دنیا کے بڑے بڑے ممالک اس پھول سے خوف زدہ ہیں۔“

”یہ بات حد درجے عجیب ہے۔۔۔ ہم اس پر ہرگز یقین نہیں کر

سکتے۔۔۔ لیکن پہلے پروفیسر داؤد کو ہوش میں لانا چاہیے۔۔۔ یہ نہیں ہو

سکتا کہ وہ بے ہوش پڑے رہیں اور آپ ہم سے باتیں کرتے رہیں۔“

”اچھی بات ہے۔۔۔ لیکن خیال رہے۔۔۔ جونہی یہ ہوش میں

آئیں۔۔۔ آپ انہیں بتا دیں کہ یہ مجھے دیکھنے کی ہرگز کوشش نہ کریں،

کیونکہ اگر یہ مجھے پھر دیکھنے کی کوشش کریں گے تو میں پھر انہیں بے

ہوش کر دوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ میں انہیں بتا دوں گا۔“

ایک منٹ بعد پروفیسر داؤد نے آنکھیں کھول دیں۔۔۔ چند لمحے

پلکیں جھپکاتے رہے، پھر حیران ہو کر بولے۔

”ہائیں۔۔۔ یہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔“

”آپ کو مسٹر ابطال نے بے ہوش کر دیا تھا۔“

”لیکن کیسے؟“ وہ بولے۔

”یہ تو ہمیں معلوم نہیں کہ بے ہوش کیسے کیا تھا، لیکن اتنا

معلوم ہے کہ کیوں کیا تھا۔۔۔ ان کا کہنا ہے۔۔۔ آپ نے انہیں دیکھنے کی

کوشش کی تھی۔۔۔ اور اس بات کا امکان تھا کہ آپ انہیں دیکھنے میں



”بس ہوا ہے۔۔۔ جیسے بادل ہوں۔“ وہ مسکرائے۔

”ہوں۔۔۔ خیر۔۔۔ اور کیا کیا چیزیں دیکھنے کے قابل ہو گئے ہیں آپ۔“

”خوشبو۔۔۔ رات کی تاریکی میں۔۔۔ ان کی مدد سے صاف نظر آتا ہے۔۔۔ اور بھی کئی کام ان سے لیے جاسکتے ہیں۔“

”بھئی دام۔۔۔ تب یہ لینز بہت مزے کی چیز ہیں۔۔۔ دو دو ہمارے لیے بھی بنا دیں۔۔۔ لیکن یہ نظریوں نہیں آرہے۔“

”باریک جھلی۔۔۔ جو کہ بالکل شفاف ہے۔۔۔ تم لوگوں کو نظر آ بھی کیسے سکتی ہے۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

”چلے خیر۔۔۔ تو آپ نے ان کی مدد سے جب مسٹر ابظال کو دیکھنے کی کوشش کی تو آپ کو کیا نظر آیا۔“

”ابھی دھندلا سا خاکہ نظر آنے لگا تھا کہ میں بے ہوش ہو گیا۔“

”اس کا مطلب ہے۔۔۔ اگر مسٹر ابظال کی چھٹی حس انہیں خبردار نہ کر دیتی تو آپ نے آج انہیں دیکھ لیا تھا۔“

”ہاں بالکل۔۔۔ لیکن افسوس۔۔۔ میری اس ایجاد کے مقابلے میں

ان کی چھٹی حس زیادہ تیز ہے۔۔۔ اب میں ان کو آنکھوں سے نکال رہا ہوں۔۔۔ تاکہ پھر سے بے ہوش نہ ہو جاؤں۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے ہاتھ آنکھوں تک لے گئے۔

”اور اب مسٹر ابظال بتا دیں۔۔۔ انہوں نے مجھے بے ہوش کس

کامیاب ہو جاتے۔۔۔ لیکن مسٹر ابظال نے یہ بات محسوس کر لی اور انہوں نے آپ کو بے ہوش کر دیا۔۔۔ اب انہوں نے آپ کی بے ہوشی کو اس شرط پر ختم کیا ہے کہ آپ یہ کوشش پھر نہیں کریں گے۔“

”حیرت ہے۔“ وہ بولے۔

”آپ کو کس بات پر حیرت ہے انکل۔۔۔ حیرت تو ہمیں ہونی چاہیے۔۔۔ ایک بات پر کہ آپ اسے دیکھنے کی کوشش کس طرح کر رہے تھے۔“

”لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ ابظال کو میری اس کوشش کا پتا کس طرح چل گیا۔“

”پہلے تو آپ ہماری حیرت کو دور کریں۔۔۔ پھر ان شاء اللہ مسٹر ابظال آپ کی حیرت کو دور کریں گے۔“ محمود نے کہا۔

”مطلب یہ کہ آج کا دن حیرتیں دور کرنے کا ہے۔“ فاروق مسکرایا۔

”میں نے ایک چیز ایجاد کی تھی۔۔۔ ایسی لینز۔۔۔ جو نظرنہ آنے والی چیزوں کو دکھا سکیں۔۔۔ اور یہ لینز میں نے ابظال کو ذہن میں رکھ کر بنائے تھے۔۔۔ لیکن ان کی مدد سے میں کئی نظرنہ آنے والی چیزوں کو دیکھنے کے قابل ہو چکا ہوں۔۔۔ مثلاً اب میں ہوا کو دیکھ لیتا ہوں۔“

”کیا۔۔۔ آپ ہوا کو دیکھ لیتے ہیں۔۔۔ اف مالک۔۔۔ وہ کیسی ہے۔“

طرح کیا تھا۔

”اپنی آنکھوں کی طاقت سے۔۔۔ یہ فن میں نے ابھی حال ہی میں حاصل کیا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”کیا مطلب۔۔۔ یہ کیسے ممکن ہے۔“ فرزانہ نے چونک کر کہا۔

”جس شخص کو بے ہوش کرنا چاہوں۔۔۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوں۔۔۔ اور وہ چند سیکنڈ کے اندر بے ہوش ہو جاتا ہے۔“

”بست خوب۔۔۔ انکل کب خال۔۔۔ ذرا میرے بھائی کو بے ہوش کر کے دکھائیں۔“ فرزانہ بول اٹھی۔

”کیا کہا۔۔۔ اپنے بھائی کو۔۔۔ خود کیوں بے ہوش نہیں ہوتی۔“

”اوہ۔۔۔ تمنا! یا نقصان ہے۔۔۔ انکل کب خال۔“

”ابطال۔“ ابطال نے بھنا کر کہا۔

”اوہ ہاں انکل۔۔۔ جب۔۔۔ نن نہیں۔۔۔ اب خال۔۔۔ ذرا میرے بھائی فاروق کو بے ہوش کر کے دکھائیں۔“

”اچھی بات ہے۔۔۔ مسٹر فاروق ذرا اوپر دیکھیں۔“

”نن نہیں۔۔۔ میں گھبراہٹ محسوس کر رہا ہوں۔“

”اوہ کچھ نہیں ہو گا۔“ فرزانہ نے سرد آواز میں کہا۔۔۔ فاروق

کے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا۔۔۔ اس کے لمبے کا مطلب وہ فوراً جان گیا۔۔۔

اس نے نظریں اوپر اٹھا دیں۔۔۔ اس کے جسم کو ایک اور جھٹکا لگا۔۔۔ وہ

تڑ سے گرا اور ساتھ ہی فرزانہ نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگا دی۔۔۔ وہ

ابطال کے جسم سے ٹکرا گئی۔۔۔ ساتھ ہی اس نے اس کی ٹانگ پکڑ لی۔۔۔ اس وقت تک محمود بھی اس کی چال کو سمجھ چکا تھا۔۔۔ اس نے بھی اس سمت میں چھلانگ لگائی۔۔۔ اور دوسری ٹانگ پکڑ لی۔

”تم لوگ بہت چالاک ہو۔۔۔ یہ بات ماننا پڑتی ہے۔“

”تو مان لیں انکل۔۔۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔“ فرزانہ ہنسی۔

”ارے۔۔۔ تو کیا تم نے مسٹر ابطال کو پکڑ لیا ہے۔“ خان رحمان

نے چلا کر کہا اور ان کی طرف دوڑ پڑے۔

”ہاں۔۔۔ اور کیا۔۔۔ جلدی کریں۔“

خان رحمان نے ابطال کو کمر سے پکڑ لیا۔

”اس کا کوئی فائدہ نہیں۔۔۔ الٹا نقصان اٹھاؤ گے۔۔۔ چوٹ کھاؤ

گے۔“ ابطال نے پرسکون آواز میں کہا۔

”وہ کس لیے۔“

”اس لیے کہ تم صرف تین ہو۔۔۔ جب کہ تم سب مل کر مجھے

پکڑتے رہے ہو۔۔۔ اور میں تم سب کے قابو میں نہیں آتا۔۔۔ تم تین تو

میری صرف ایک جھرجھری کی مار ہو۔۔۔ تم نہیں جانتے۔۔۔ اس بار میں

چند نئی تیاریوں کے ساتھ آیا ہوں۔“

”اوہ اچھا۔۔۔ تو یہ بات ہے۔۔۔ ذرا لے کر دکھائیں جھرجھری۔“

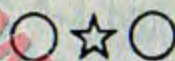
محمود نے منہ بنایا

”ضرور کیوں نہیں۔۔۔ اگر چوٹ کھانے کا اتنا ہی شوق ہے۔۔۔ تو



یہ لو۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے ایک ہلکی سی جھرجھری لی۔ وہ  
تینوں اچھل اچھل کر کمرے کی دیواروں سے بری طرح ٹکرائے۔ لیکن  
ساتھ ہی ابظال کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔  
”ارے.... یہ کیا؟“



www.pakfunplace.com